www.urduchannel.in

ٹنڈے کباب

(طنز و مزاح)

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

ٹنڈے کباب

(طنز و مزاح)

ڈاکٹر محبوب حسن

www.urduchannel.in

LOGO.jpg not found.

© ڈاکٹر محبوب حسن

TUNDAY KABAB

by: Dr. Mahboob Hasan
Mob: + 91 8527818385
+ 91 8381856066
E-mail: mahboobafaqi@gmail.com

Year of Edition 2017   ISBN 978-93-86624-06-2

` 150/-

کتاب : ٹنڈے کباب
مصنف : ڈاکٹر محبوب حسن
سال طباعت : ۲۰۱۷ء
قیمت : ۱۵۰ روپے
صفحات : ۱۱۶
سرورق : رضی شہاب
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔M.08401010786
☆ ہمالیہ بک ورلڈ، حیدر آباد۔ Ph. 040-66822350
☆ حسامی بک ڈپو، حیدر آباد۔Ph. 040-66806285
☆ انجمن ترقی اُردو، حیدر آباد۔ M. 09247841254
☆ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدر آباد۔Ph.040-24411637
☆ دکن ٹریڈرس، حیدر آباد۔Ph.040-24521777
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی۔Ph.022-23774857
☆ کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئیPh.09869321477
☆ بُک امپوریم، پٹنہ۔ M.09304888739
☆ عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔M.09433050634
☆ دانش محل، لکھنؤ۔Ph.0522-2626724
☆ راعی بک ڈپو، الہ آباد۔M.09889742811
☆ مرزاورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔M.09325203227
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
☆ کشمیر بک ڈپو، سری نگر،M. 09419761773
☆ مکتبہ علم وادب، سری نگر M. 094419407522
☆ گلوبل بکس، سرینگر،M. 09070340905
☆ وطن پبلیکیشنز، سری نگر،M. 09419003490
☆ قاسمی کتب خانہ، جموںM. 09797352280
☆ نعیم بک سیلرز، مئوناتھ بھنجن، M.09450755820

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

انتساب

اردو کے ان قارئین کے نام

جنھیں کتابوں سے بے پناہ محبت ہے

لیکن

مطالعہ کے لیے وقت نہیں!

نوٹ

- یہ کتاب وظیفے کی بچی کھچی رقم سے شائع کی گئی ہے۔
- کتاب کے تمام کردار اور واقعات فرضی نہیں ہیں۔
- کسی بھی طرح کی مماثلت کے لیے صرف مصنف ذمہ دار ہے۔
- کسی بھی قسم کے تنازع کی چارہ جوئی عدالت خداوندی میں ہی ممکن ہے۔
- کتاب کے مشمولات سے قارئین کا متفق ہونا ضروری ہے۔

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

کباب برائے ثواب

کبھی بھی ہو نہیں سکتے وہ فین انڈے کے
جنہوں نے کھائے ہیں ساغر کباب ٹنڈے کے
یہی کباب ہیں جزوے غذائے انسانی
ہزاروں مُردوں کی ہوتی ہے فاتحہ خوانی
سنا ہے وعظ میں فرما رہے تھے مولانا
کباب ٹنڈے کے اپنے کفن میں لے جانا
یہی نہیں ہے کہ زندہ مزے اڑائیں گے
یہی کباب تو مردوں کو بخشوائیں گے
یہی کباب تو جسموں کو جان دیتے ہیں
بوقت صبح شکم میں اذان دیتے ہیں
تو جنتی ہے، روز حساب بولیں گے
زباں خموش رہے گی کباب بولیں گے
وہ دوزخی کو بھی جھک کے سلام کرتے ہیں
یہی کباب فرشتوں کو رام کرتے ہیں
یہی ہے سچ تو سنیں ہم سے رنگ و بو والے
نرک میں جا نہیں سکتے لکھنؤ والے

(ساغر خیامی)

''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ آپ نے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کردیں''

— پطرس بخاری

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

فہرست

اعتراف	11
ٹنڈے کباب کی یاد میں	19
رومیو کی آزمائش	25
جس جلسے میں طلبا کو میسر نہ ہو بوٹی	31
میرے اللہ پی ایچ ڈی سے بچانا مجھ کو	37
سارے جہاں سے چوپٹ ہندوستاں ہمارا	47
ٹرین کا عبرت ناک سفر	55
قصہ ایک ادبی سیمینار کا	61
ڈھائی گھنٹے کا علی گڑھ	69
مس اردو سے ایک یادگار ملاقات	77
ایسی آزادی سے بہتر ہے غلامی یا رب	91
رشوت برائے رحمت	97
اگلے جنم مجھے گئو ماتا نہ کیجیے	103
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں	111

☆☆

”مشہور ہے کہ حیدرآبادی و مرادآبادی بریانی کی خوشبو لاہور و کراچی کی گلیوں تک پہنچتی ہے۔ معروف پاکستانی روزنامہ ”نوائے پاکستان“ کے مطابق حیدرآبادی اور مرادآبادی بریانی کی خوشبو سے ہم آغوش ہوتے ہی پاکستان کی مسلح فوجیں ہتھیار ڈال دیتی ہیں۔ حالیہ دنوں امریکہ کی ایک معتبر خفیہ ایجنسی نے یہ راز فاش کیا ہے کہ ہندو پاک کی سرحد پر تناؤ بڑھتے ہی ہندوستانی حکومت فوری طور پر بریانی کی دیگیں چولہوں پر چڑھوا دیتی ہے تاکہ پاکستانی فوجیں بریانی کی خوشبو سے ڈھیر ہو سکیں۔ اس امریکی ایجنسی کی رپورٹ کے مطابق فتح کارگیل اور سرجیکل اسٹرائک کی کامیابی حیدرآبادی اور مرادآبادی بریانی کی برکت کا ہی ثمرہ ہے۔ ایک عرصۂ دراز سے پاکستان خوف زدہ ہے کیوں کہ اس کے پاس ہندوستان کے اس ہتھیار کا کاٹ ابھی تک موجود نہیں۔“

▬ ڈاکٹر محبوب حسن

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

اعتراف

ادیبوں اورفن کاروں پرعجیب مشکل دورآن پڑا ہے۔تازہ اطلاع کے مطابق چند ایک کو دورے بھی پڑنے لگے ہیں۔ان کے چہروں سے بے چارگی صاف جھلک رہی ہے۔مسئلہ دراصل قارئین اور وقت کا ہے۔شکر خداوندی ہے کہ کم از کم کتابیں دھڑا دھڑ برق رفتاری سے شائع ہو رہی ہیں۔لیکن افسوس کہ کسی کے پاس مطالعے کا وقت نہیں۔ ہر شخص ہوا کے دوش پر سوار اور اپنی ذات میں محدود نظر آتا ہے۔ انٹرنیٹ کے توانا کندھوں پر وقت بچانے اور آسانیاں پیدا کرنے کی ذمہ داری تھی لیکن ''گر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے'' کے مصداق دھوکہ ہی دھوکہ۔شاطرانہ چال کا ایک پراسرار سفر۔جیسے پورا انسانی معاشرہ کسی بے نام سازش کا شکار ہو۔

کتب خانوں میں گہری خاموشی اور سناٹا ہے۔کبھی دوشیزائیں مجازؔ کی شاعری کو تکیے کے نیچے چھپائے اپنی جھیل سی آنکھوں سے آنسو بہاتی تھیں لیکن اب ان کی آنکھوں کا کاجل کسی اور وجہ سے بھیگتا ہے۔ایک وہ زمانہ تھا جب ''کلیات ساحرؔ'' چوری ہو جانے پر بلبل جونپوری کی بیگم صاحبہ عالمِ غم میں دوپہر سے شام تک بے ہوش رہیں۔ لیکن افسوس کہ اب کتابوں پر کسی کی نیت خراب نہیں ہوتی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ جس معاشرے میں کتابوں کی چوریاں رک جائیں، وہاں انسانی قدروں کا زوال یقینی ہے۔

اسی فکر میں خاکسار یہ عملِ صالح دانستہ کر بیٹھتا ہے۔

شادی کی ریشمی زنجیروں میں جکڑے ہوئے چند ادیبوں سے پچھلے دنوں یہ راز فاش ہوا ہے کہ زمانہ حال میں بیویاں کتابوں کو سوتن سمجھ کر اسے مسلسل کوسنے میں مشغول رہتی ہیں۔ بلکہ موقع ملتے ہی کتابوں کو کسی کباڑیے کے ہاتھوں اونے پونے بیچ دینے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتیں۔ واقعہ ہے کہ مصروفؔ حیدرآبادی صاحب پیشے سے وکیل ہیں، ساتھ ہی شعروادب سے بھی شغف رکھتے ہیں۔حضرت کے دل میں شعرو شاعری کے تیرِ نیم کش کی خلش ابھی بھی برقرار ہے۔ان کے گھر پر آئے دن ادباء وشعراء کا ہجوم نظر آتا ہے۔گھر پر تشریف لانے والے مہمان ادیبوں وشاعروں کی خاطر تواضع میں ان کے بسے بسائے گھر کے اجڑ جانے کی خبر عام ہے۔

مصروفؔ صاحب نے اپنی خواب گاہ کو بھی کتابوں سے آباد کر رکھا ہے۔ان کی بیگم اداس صاحبہ کو اپنے شوہر کی یہ حرکت ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی ۔ کیوں کہ اپنی اہلیہ کی زلفوں کو سنوارنے کے بجائے وہ غزلوں کا قافیہ ردیف درست کرنے میں ہی شب وروز گزار دیتے ہیں۔اپنے شوہر حضور کی اس نرگسی مصروفیت کے سبب محترمہ مسلسل ہجرو فراق کے شعلوں میں جھلستی رہی ہیں۔ انہوں نے کتابوں کو کسی کباڑیے کے حوالے کر دینے کی کھلی دھمکی بھی دے رکھی ہے۔محترمہ کو بس کسی موقعۂ غنیمت کا انتظار ہے۔ڈرے سہمے مصروف حیدرآبادی صاحب آج کل غم شاعری اور غم جاناں کے بیچ معلق ہیں۔

خدارحم کرے!! اس جادوئی دور میں معصوم بچوں کی زندگی موبائل اور انٹرنیٹ کی زد میں ہے۔ اپنی پیاری امّی جان کی بے لوث مصروفیت کی وجہ سے بے زبان بچے بھی اکثر بھوکے پیاسے اور بلبلاتے نظر آتے ہیں۔ کاش کبھی کسی معصوم کی شدت بھوک پر دریائے رحمت جوش میں آجائے! کاش زمین پر اس کی ایڑیاں رگڑنے سے دودھ کا کوئی چشمہ پھوٹ پڑے! پہلے مائیں دوسرے کاموں کے لیے مشکل سے وقت نکال پاتی

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

تھیں لیکن اب بچوں کے واسطے مشکل سے فراغت پاتی ہیں۔حالات کچھ ایسے ہیں کہ شوہر اور بیوی دونوں کسی خودمختار صوبے کی مانند آزاد اور خود کفیل ہیں۔دونوں کی زندگی ریل کی پٹریوں کی طرح معلوم پڑتی ہے۔پٹریاں منزل تک ہمراہ چل سکتی ہیں لیکن ان کا ہم آغوش ہونا ممکن نہیں۔دونوں کے پاس ایک دوسرے پر محبت کی آدھی نظر بھی ڈالنے کی فرصت نہیں۔زندگی اب کثرتِ عشق اور حسرتِ عشق کے درمیان الجھی ہوئی ہے۔

چپکنا فون سے خانم کا سنتے آئے تھے لیکن!!!

بے چارے ناول نگار سب سے زیادہ فکرمند نظر آتے ہیں۔کیوں کہ ناول کی ضخامت پہلی نظر میں ہی قاری کو اندر تک گھائل کر دیتی ہے۔ایسے میں اگر ناول کو قاری کی بابرکت انگلیوں کا لمس اور نظرِ عنایت کا صرف ایک بوسہ میسر آ جائے تو غنیمت ہے۔سچ کہیے تو ''لہو کے پھول'' جیسے ضخیم ناول کی ضخامت دیکھ کر ہمت جھلس جاتی ہے۔فی زمانہ ناول کا صرف نام یاد رکھ لینا باعث ثواب ہے۔وہ وقت دور نہیں، جب ناول اور داستان محمود و ایاز کی مانند ایک ہی صف میں نظر آئیں گے۔ناول بھی داستان کی طرز پر عظمت رفتہ کا نشان بن کر رہ جائے گا۔کیوں کہ داستان ایکسپریس نے افسانچہ نگر تک کا سفر طے کر لیا ہے۔دور اندیش فن کاروں نے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کی مریدی اختیار کر لی ہے۔ایسے تخلیق کار افسانچہ نگر میں زمین کی تلاش میں شب و روز مصروف ہیں۔انصاف کی بات ہے کہ ہر فن کار کو یہ ادبی حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مرضی و خوشی سے آزادانہ سرزمینِ ادب کے کسی بھی صوبے یا ضلع میں اپنے خوابوں و حسرتوں کے تخلیقی گھروندے بسا سکے۔

دوسری اہم بات یہ کہ آج دنیا بھر کی زبانوں کے درمیان ایک جنگ سی چھڑی ہوئی ہے۔یعنی اپنے وجود کو قائم رکھنے کی جدوجہد۔ایسی صورت حال میں ادب سے زیادہ زبان کو فروغ دینا وقت کا اہم تقاضا ہے۔کیوں کہ ادب کے لیے زبان کا ہونا شرطِ

اوّلین ہے۔اردو زبان کی نئی فصل اُگانے کے لیے زمین پر ہل چلانے کی ضرورت ہے۔دریا اور آسمانوں میں تخم ریزی دیوانے کا خواب ہے۔ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی آڑ میں ہونے والی نوک جھونک لا حاصل ہے۔اس لیے کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلانے کی ضرورت ہے۔

خاکسارانہ التجا ہے کہ عاشقانِ اردو اپنے پڑوسیوں کو اردو کی مے پلائیں۔لوگوں کے کانوں میں اردو کی مٹھاس گھولیں۔تاکہ ریلوے اسٹیشنوں کے بک اسٹالوں پر بھی میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، فیضؔ، منٹو، بیدی اور عصمت کا دیدار ہو سکے۔اردو کو آج پھر سے کسی اور نظیرؔ اکبرآبادی کی شدید ضرورت ہے۔تاکہ اردو کی مشترکہ روایات کے حسین تاج محل کی آب و تاب برقرار رہے۔اب مصلحت پسندی، تنگ نظری اور تعصب کو تج کر اپنی تمام تر توانائی شہرِ اردو کو نئے سرے سے آباد کرنے میں صرف ہونی چاہیے۔اس لیے مفتیانِ ادب کو از سرِ نو غور و فکر کرنے کی انتہائی ضرورت ہے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نہ ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

مقام افسوس ہے کہ ادب اطفال اور طنزیہ و مزاحیہ ادب پر بے رحمی سے فتوے جاری کیے گئے۔انھیں دوئم درجے کا شہری بنا دیا گیا۔لیکن مسرت کا مقام ہے کہ عصر حاضر میں ادب کے یہ حاشیائی کردار رفتہ رفتہ مرکز کی جانب لوٹ رہے ہیں۔تاریخ شاہد ہے کہ کم و بیش دنیا کی ہر زبان میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کی ایک دلچسپ روایت موجود ہے۔یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ طنز و مزاح کے بغیر ادب کا وجود ادھورا ہے۔کیوں کہ انشائیہ میں پوشیدہ طنز انسانی سماج و معاشرے کے لیے تازیانے کا کام کرتا ہے۔اس کی ادبی و سماجی اہمیت کے پیشِ نظر یہ بات بغیر اجازت کہی جا سکتی ہے کہ آنے والا زمانہ یقینی طور پر طنزیہ و مزاحیہ ادب کا ہوگا۔اس کا مستقبل کہکشاں کی مانند روشن و چمک دار ہے۔

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

آج دنیا کے حسین و نازک لبوں سے مسکراہٹ غائب ہے۔ ہر شخص غم و اداسی کا پشتارہ لیے بھٹک رہا ہے۔اس کے پیروں میں لاچاری و بے بسی کے جاں گداز کانٹے چبھے ہوئے ہیں۔ ناکامی و نامرادی کی لہروں میں ہچکولے کھانا آج کے انسان کا مقدر بن گیا ہے۔اپنے کندھوں پر کاغذ کی کشتیاں اٹھائے سمندر کی مانند تھکا تھکا سا دکھائی دیتا ہے۔ آنکھوں میں جلن، سینے میں طوفان لیے ہر شخص پریشانی میں مبتلا نظر آتا ہے۔ مسکراہٹ اور قہقہوں کے بغیر واقعی یہ دنیا بیوہ اور انسانی زندگی یتیم ہوگئی ہے۔

دراصل انسانی زندگی کے سر سے مسکراہٹ کی چادر ہی غائب ہے۔ ہر طرف کڑی دھوپ اور شبِ فراق ہے۔ خدارا!!! اب تو ناصر کاظمی مرحوم کے خیالِ یار کی چادر بے اثر ہوگئی ہے۔محبوب کی زلفوں کی گھنی چھاؤں اور وصل کی راحتوں میں بھی اب وہ کشش باقی نہ رہی۔ جیسے غم جاناں اور غم دوراں کے علاوہ کسی اور غم نے کاروبار زیست شروع کردی ہو۔ایسے میں طنز و مزاح کے ذریعہ ہی پاؤں میں چبھے غم کے کانٹوں اور دل کی ویرانی کا علاج ممکن ہے۔اس کے دم پر ہی گلشن حیات میں رنگ آمیزی ممکن ہے۔ فی زمانہ قہقہہ لگانا واقعی مہمات کے سر کرنے سے کم نہیں۔ بابائے ظرافت مجتبیٰ حسین نے ہنسنے، مسکرانے اور قہقہہ لگانے کو کسی ایڈونچر سے تعبیر کیا ہے۔انہوں نے اپنے مضمون ''تکلف برطرف'' میں بجا طور پر لکھا ہے:

> ہنسنے کو ایک مقدس فرض جانتا ہوں اور قہقہہ لگانے کو دنیا کا سب سے بڑا ایڈونچر۔ سائنس کی ترقی نے انسان کی شخصی مہماتی زندگی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔امریکہ کو کولمبس نے دریافت کر لیا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو کسی اور نے فتح کر لیا۔سائنس دانوں نے چاند پر کمندیں پھینک دیں۔اب عام آدمی کے پاس ایڈونچر کے لیے باقی ہی کیا رہ گیا ہے۔ لے

> دے کے وہ صرف قہقہہ ہی لگا سکتا ہے۔اور جب کوئی شخص کھل کر قہقہہ لگاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے امریکہ کو دوبارہ دریافت کرلیا ہو یا ماؤنٹ ایورسٹ کو پھر سے سر کرلیا ہو۔ زندگی کے بے پناہ غموں میں گھرے رہنے کے باوجود انسان کا قہقہہ لگانا ایسا ہی ہے جیسے وسیع سمندر میں بھٹکے ہوئے جہاز کو اچانک کوئی جزیرہ مل جائے۔''

کبھی کبھی زندگی کا کوئی ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہوتا ہے۔معروف سائنس داں نیوٹن کے سامنے کسی شجر سے سیب کا گرنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا بلکہ اس میں انسانی تہذیب وثقافت کی تعمیر و ترقی کے ہزاروں راز پنہاں تھے۔موت بھی کسی نہ کسی بہانے کی تلاش میں پھرتی بھٹکتی ہے۔اسی طرح کسی فن کار کے اندر پرورش پانے والا فن پارہ بھی کسی خاص لمحاتی کیفیت کا منتظر رہتا ہے۔ جذبات و احساسات لفظوں کا بھیس بدل کرادب پارے کا روپ دھارن کر لیتے ہیں۔تخیل کی بلند پروازی کے باوجود تخلیقی ہانڈی کو تجربات و مشاہدات کی آنچ درکار ہوتی ہے۔ راقم الحروف کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ رہا ہے۔کسی خاص مشاہدے نے ہی مجھے اس جانب متوجہ کیا۔

خاکسار کے پاس کوئی تخلیقی وراثت ہے اور نہ ہی میں کسی ادبی خانوادے کا چشم و چراغ ہوں۔ دسویں جماعت میں میری کوئی کہانی شائع ہوئی اور نہ ہی مجھے کوئی انعام ملا۔مقام شکر ہے کہ میں مادھو، گھیسو، بدھیا، ہوری اور گوبر کے گاؤں میں پیدا ہوا اور وہیں پر میری پرورش و پرداخت ہوئی۔ میں نے سردی کی کپکپاتی راتوں میں گھیسو اور مادھو کو الاؤ کے پاس آلو کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔وہاں گیہوں، چنے، باجرے اور مکئی کے علاوہ ایمانداری کی روٹی بھی ملتی ہے۔میرے گاؤں کے نزدیک ہی ایک گھنا جنگل ہے، جہاں سے نکل کر انسانوں نے شہر در شہر بسائے اور تہذیب وثقافت کی فلک بوس عمارتیں

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

تعمیر کیں لیکن ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔'' شہراب جنگلوں کے لیے ترس رہا ہے۔وہاں بیت الخلا کے برتن آج بھی زنجیروں کی قید سے آزاد نظر آتے ہیں۔

کتاب میں شامل مضامین کا سلسلہ ۲۰۱۲ کے آس پاس شروع ہوا تھا۔ یہ سلسلہ کبھی تیز رفتاری تو کبھی سست رفتاری سے جاری رہا۔ بیشتر مضامین مخصوص حالات و واقعات سے متاثر ہوکر لکھے گئے ہیں۔اس لیے ان میں جگہ جگہ اضطرابی کیفیت اور جذباتیت در آئی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میری ان تحریروں میں خالص فکری وفنی حسن کی تلاش بے معنی ہے۔ابھی پرورشِ لوح وقلم کا آفتاب طلوع ہوا ہے۔ میری یہ تخلیقی کاوش رہِ عشق کی ابتدائی منزل ہے۔قوی امید ہے کہ تحریروں میں قارئین کو ارتقائی تسلسل کا احساس ضرور ہوگا۔ میری تخلیقات خواص پسند ہوتے ہوئے بھی گفتگو مجھے ہمیشہ عوام سے رہی ہے۔خاکسار کو اردو کے عام قارئین کی تلاش وجستجو ہے۔ عام قاری نفرت کی آندھیوں میں بھی اردو کی شمع کو روشن رکھ سکتا ہے۔اس کی محبت اور حوصلہ افزائی میرے نزدیک تبرک کا درجہ رکھتی ہے۔

کتاب میں شامل تمام مضامین کسی نہ کسی رسالے یا اخبار کی زینت بن چکے ہیں۔اس تخلیقی سفر کے ابتدائی مرحلے میں میری تحریریں ماہنامہ کسوٹی جدید، خبرنامہ اردو اکادمی یوپی، روزنامہ انقلاب، راشٹریہ سہارا، ہندوستان ایکسپریس، متاعِ آخرت، اپنا وطن اور اردو نیٹ جاپان وغیرہ میں مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں۔ میں مذکورہ بالا اخبارات وجرائد کے مدیر صاحبان کا تہہ دل سے ممنون ومشکور ہوں۔ان حضرات کی حوصلہ افزائی کے سبب میری تحریریں جلد ہی شگوفہ حیدرآباد، کتاب نما دہلی اور ذہن جدید دہلی میں جگہ پانے لگیں۔ خاص طور پر میں شگوفہ کے مدیر محترم مصطفیٰ کمال صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں، جنھوں نے اپنے ہر دل عزیز رسالہ شگوفہ میں مجھ خاکسار کو مسلسل جگہ دی۔

میرے اس تخلیقی سفر میں بہت سی قابل قدر شخصیات کی محنت ومحبت شامل حال

www.urduchannel.in

رہی ہے۔آپ سب لوگوں کی انمول دعاؤں، نیک حسرتوں، محبت آمیز حوصلہ افزائی، صحیح رہنمائی اور پرخلوص تنقید نے خاکسار کے لیے راہیں ہموار کیں۔والدین، اساتذہ، اہل وعیال، احباب اور قارئین کی خدمت میں ہدیہ تشکر! خالق کائنات کے حضور میں آپ سب لوگوں کی خیر وسلامتی کی دعائیں!!!

ڈاکٹر محبوب حسن

www.urduchannel.in

ٹنڈے کباب کی یاد میں

لکھنؤ کے ''ٹنڈے کباب'' میں کباب اگر جسم ہے تو ٹنڈے اس کی روح۔ دونوں میں جسم و جاں کا رشتہ ہے۔ لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی طرح ''ٹنڈے کباب'' کے درمیان بھی ازلی رشتہ ہے۔ ٹنڈے اور کباب کے رشتے پر ٹیڑھی نظر ڈالنا لکھنوی تہذیب کی شان میں عین گستاخی ہے۔ ٹنڈے کباب اپنی سیرت وصورت دونوں اعتبار سے قابل رشک ہے۔ اس کے تقدس کی تفہیم کے لیے بصیرت اور بصارت کی نظر درکار ہے۔ ٹنڈے کباب کے دیدار محض سے سطح ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ ٹنڈے کباب کے سامنے شیراز کے میخانے اور خیاّم کی رباعیاں بے اثر ہیں۔ اس میں کوثر و تسنیم اور آب زمزم کی پاکی اور کوہِ قاف کا حسن موجود ہے۔

سرزمینِ لکھنؤ پر قدم رکھنا اگر فرض ہے، تو ''ٹنڈے کباب'' سے لطف اندوز ہونا سنت قرار پاتا ہے۔ اسی لیے لکھنؤ آنے والا ہر خاص و عام ''ٹنڈے کباب'' کو سلام عقیدت پیش کرنا عین سعادت مندی تصور کرتا ہے۔ اس سے محرومی پر فرشتے لعنت بھیجتے ہیں۔ اہل لکھنؤ ''ٹنڈے کباب'' کو توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' کی برکت سے گناہِ صغیرہ سوکھے ہوئے پتوں کی طرح جھڑ جائیں گے۔ قبر کے عذاب میں بھی تھوڑی بہت رعایت ممکن ہے۔ اس کی سماجی وتہذیبی اہمیت کا اندازہ اس

شہرِ نشاط میں درپیش ایک واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دفعہ حسب وعدہ باراتیوں کی خاطر تواضع میں ''ٹنڈے کباب'' کا اہتمام نہ ہونے سے دولہے نے عین موقع پر نکاح سے انکار کر دیا۔ قابل غور ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' سے خاکسار کا رشتہ روحانی نوعیت کا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ وصال عشق کی موت ہے۔ اس لیے دل میں جب بھی ''ٹنڈے کباب'' کی تمنائیں جاگتی ہیں تو اس کا ورد شروع کر دیتا ہوں۔ اس عملِ بابرکت کی بنیاد پر ہی ''ٹنڈے کباب'' کی روحانی خوشبو سے دل و دماغ دونوں معطر ہو جاتے ہیں۔ یعنی عشق میں اگر گرمی ہو تو ہجر میں بھی وصال کا لطف آتا ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ لکھنؤ میں ایک بزرگ نواب صاحب ہوا کرتے تھے۔ ان کی بتیسی جھڑ چکی تھی لیکن حضرت کباب کے بہت شوقین تھے۔ لہذا انہوں نے کبابیوں کے درمیان مقابلہ آرائی کا اعلان کیا۔ شہر در شہر سے کبابیے جوق در جوق شاہی دربار میں جمع ہوئے۔ انواع واقسام کے کباب تیار کیے گئے۔ دربار کی پوری فضا کباب کی خوشبو سے مہک اٹھی۔ کبابیوں نے اپنے اپنے کباب ترتیب سے میز پر سجا دیے۔ دربار کا سارا منظر کبابی بازار جیسا ہو گیا۔ نواب نے باری باری سے سب کے کباب چکھے۔ نواب کو حاجی مستان علی کا گلاوٹی کباب بہ شکل شامی کباب بے حد پسند آیا۔ حاجی مستان علی کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔ عزت افزائی کے بعد انہوں نے لکھنؤ میں کباب کی دکان کھول لی۔ ان کے کباب کی شہرت جلد ہی دور دور تک پھیل گئی۔ بہت سے کبابیوں نے ان کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے کیوں کہ ایک سو بارہ قسم کے مسالے کہاں سے لاتے؟ حاجی مستان علی کو پتنگ بازی کا بھی شوق تھا۔ بدقسمتی کہیے کہ ایک روز پتنگ اڑاتے ہوئے چھت سے نیچے آن پڑے اور ایک ہاتھ تڑوا بیٹھے۔ اس حادثے کے بعد حاجی مستان علی ٹنڈے میاں اور ان کا کباب ''ٹنڈے کباب'' کے نام سے مشہور ہوا۔ ''ٹنڈے کباب'' کی زلف عنبریں کو سنوارنے میں ان کی کئی پشتیں گزر گئیں۔

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

ویسے تو لکھنوی ''ٹنڈے کباب'' کی شہرت سرحدوں میں قید نہیں۔اس کی لذت وخوشبوتو عرشِ معلیٰ تک پہنچتی ہے۔لیکن آج کل اس کا چرچہ ملک کے ہرکوچہ وبازار میں ہے۔کیوں کہ لکھنوی ''ٹنڈے کباب'' ان دنوں طوفان کی زد میں ہے۔کم وبیش گزشتہ سو برسوں میں ''ٹنڈے کباب'' پہلی دفع فاقہ کشی کا شکار ہوا ہے۔یہ سچ ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' پر سیاسی گرہن لگا ہوا ہے۔ارے بھائی! گرہن تو چاند اور سورج کو بھی لگتا ہے۔دراصل زوال عروج کا مقدر ہے۔جب لکھنوی حکومت کا سورج ڈھل گیا تو ''ٹنڈے کباب'' کی کیا بساط؟ ملک کے مختلف حصوں سے ٹنڈے کباب کی تعزیت کی خبریں موصول ہورہی ہیں۔خاص طور پر لکھنؤ میں تو صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔بعض صاحبان کا خیال ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' کے دم پر ہی لکھنوی تہذیب زندہ تھی۔لیکن اب چراغوں میں روشنی نہ رہی:

محفلیں اب کہاں نوابوں کی
صحبتیں اب کہاں جنابوں کی
کھینچ لاتی ہے لکھنؤ ہم کو
ٹنڈے خوشبو تیرے کبابوں کی

خدا ''ٹنڈے کباب'' کو ہر بلا سے محفوظ رکھے!!! ایسے مایوس کن حالات میں ''ٹنڈے کباب'' کے حق میں دعائیں ضروری ہیں۔''ٹنڈے کباب'' پر قہر نازل ہوتے ہی لکھنوی تہذیب کا آخری ستون بھی گر پڑا۔درحقیقت اس کے ذکر کے بغیر اودھ اور اس کی تہذیبی تاریخ ادھوری ہے۔اس ستم ظریفی پر شہر کا ذرہ ذرہ اداس ہے۔امام باڑوں میں ماہِ محرم کی فضا طاری ہے۔لکھنو کا شاہانہ دسترخوان اجڑ سا گیا ہے۔عیش وعشرت اور مستی ونشاط کا یہ شہر سائیں سائیں کررہا ہے۔جیسے یہاں کی رونقیں، چہل پہل، ریل پیل کو کسی بدخواہ کی نظر لگ گئی ہو۔

کبھی نخاس اور امین آباد کے علاقوں میں انسانوں کا جم غفیر موجود ہوتا تھا۔جہاں ہوائیں بھی مشکل سے گزر پاتی تھیں۔بدن سے بدن چھلتا تھا لیکن اب ہر طرف سناٹا ہی سناٹا۔جیسے گلیوں، بازاروں اور کوچوں میں بیوگی طاری ہو۔جیسے پورا شہر روٹھ گیا ہو۔جیسے چاند، سورج اور ستارے اپنی گردش بھول گئے ہوں۔کبھی لکھنؤ کی شامیں رومانی ہوا کرتی تھیں۔شب وصال کے سامنے شب فراق دھول چاٹتی پھرتی تھی۔مے خانوں سے زیادہ کباب خانوں میں رونق رہتی تھی لیکن اب ٹنڈے کباب کے فراق میں لکھنؤ کا حال کچھ یوں ہے۔بقول میرؔ:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

''ٹنڈے کباب'' کے ہجر میں اس کے عاشق زار بیمار سے نظر آتے ہیں۔اس سے بے پناہ چاہت ورغبت رکھنے والے دیوانوں کی نوک زباں پر صرف یہی نغمہ ہے کہ ''تیرا جانا ارمانوں کا لٹ جانا''۔اس شمع فروزاں کے ذکر کے سبب ان کی زبانیں گھس گئی ہیں۔ان کے ایمان میں بھی اب وہ گرمی باقی نہ رہی۔عاشقوں کے ساتھ ساتھ کبابیوں میں بھی غم واداسی کی لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔کبابیے ''ٹنڈے کباب'' کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے مرغ، انڈے اور سبزی کا سہارا لے رہے ہیں۔لیکن گوشتِ معظم کے بغیر ''ٹنڈے کباب'' کا وجود پارہ پارہ ہوگیا ہے۔

مذکورہ اشیاء کے بنے ہوئے ٹنڈے میں وہ بات کہاں؟ نہ لطافت، نہ نزاکت، نہ لذت، نہ عظمت۔بس ایک رسمِ واجبی سی پوری ہورہی ہے۔خدا معاف کرے! یہ تو ''ٹنڈے کباب'' کی شان میں سراسر گستاخی اور بے ادبی ہے۔دکانوں کے باہر ''ٹنڈے کباب'' کی جگہ ''مرغ کباب''''انڈے کباب'' اور ''سبزی کباب'' کی تختیاں لگائی گئی ہیں۔دراصل یہ تختیاں ''ٹنڈے کباب'' کی عظمت رفتہ کی داستان معلوم پڑتی

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

ہیں۔لیکن اس کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ شاید کوئی نیا نسخہ ہاتھ لگ جائے۔

بعض دکانوں پر جلی حروف میں فیضؔ کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' چسپاں کی گئی ہے۔لیکن داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر دیکھ کر عاشقوں کو یک گونہ سکون میسر نہیں۔انھیں سفینۂ غمِ دل کے رک جانے کا شدت سے انتظار ہے۔جنون ومحبت اور نالہ وفریاد کی یہ شدت پتھر کو بھی پگھلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔قوی امید ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' پر چھائے ہوئے سیاسی بادل جلد ہی چھٹ جائیں گے۔کیوں کہ ''ٹنڈے کباب'' کے پروانوں کا یقین ہے کہ ''لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے''۔عرض کرتا چلوں کہ گزشتہ جمعرات کی شب اکبری گیٹ پر ''کبابی مشاعرہ'' کے نام سے ایک شاندار شعری نشست کا انعقاد ہوا۔اس تقریب میں سرزمین لکھنؤ کے نامی گرامی شعراء شاعرات جمع ہوئے۔مشاعرے کا ہجوم ایسا کہ سامعین کو مجبوراً امام باڑے کی چھت پر چڑھنا پڑا۔لوگ مکھیوں کی طرح ایک دوسرے سے چپک چپک کر بیٹھے تھے۔دراصل یہ ہجوم ''ٹنڈے کباب'' کی شان وعظمت کی گواہی دے رہا تھا۔

کسی نے ''ٹنڈے کباب'' کی شان وعظمت میں قصیدے پڑھے تو کسی نے اس کی خستہ حالی کا مرثیہ سنایا۔مخمل بربادؔی نامی ایک شاعر نے شہر آشوب کے پردے میں لکھنؤ کے تہذیبی وتمدنی زوال کی داستان پیش کی۔انصاف کی بات ہے کہ اردو داں حضرات کو'' ٹنڈے کباب کے عصری مسائل'' کے موضوع پر آناً فاناً ایک کل ہند سیمینار منعقد کرنا چاہیے۔کیوں کہ اردو کے بیشتر کلاسیکی شعراء نے کباب،شراب اور شباب کے سہارے ہی اپنا شعری لقمہ توڑا ہے۔

قابل ذکر ہے کہ میرؔ جیسے عظیم المرتبت شاعر نے بھی اپنی ایک مشہور غزل کی بنیاد کباب،شراب،شباب،حجاب،اضطراب اور خراب جیسے قوافی پر رکھی ہے۔اس غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔''داغ رہنا دل وجگر کا دیکھ / جلتے ہیں اس طرح کباب کہاں''یعنی

وہ کباب کے بغیر اپنے دل وجگر کی سوزش وجلن سے پردہ اٹھانے میں قاصر ہیں۔بہر حال مشاعرے میں ''ٹنڈے کباب زندہ باد'' کے فلک شگاف نعرے بھی لگائے گئے۔اس شعری محفل کی تکمیل میں پوری شب گزر گئی۔فجر کی اذان ہوتے ہی ناظم مشاعرہ نے فیض کے اس شعر کے ساتھ سامعین کو خدا حافظ کہا کہ:

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

قابل ذکر ہے کہ مٹن تکہ، چکن تکہ، مٹن بریانی، چکن بریانی، مٹن قورمہ، چکن قورمہ جیسی مرغن غذائیں ''ٹنڈے کباب'' کے خلا کو پر کرنے میں ناکام ہیں۔لیکن اس قدر ہائے توبہ مچانا جائز نہیں۔اپنے اندر صبر ایوبی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔خدا کی نافرمانی پر تو حضرت آدم بھی جنت سے نکالے گئے تھے۔''ٹنڈے کباب'' کی حالت زار دیکھ کر ''حیدرآبادی پایہ'' اور ''مرادآبادی بریانی'' بھی خوف زدہ ہیں۔انھیں فکر ہے کہ جانے کب سیاست کی برچھیاں ان کے سینے میں بھی اتار دی جائیں۔

ظاہر ہے کہ ''حیدرآبادی پایہ'' اور ''مرادآبادی بریانی'' کی شہرت تحت الثریٰ تک پھیلی ہوئی ہے۔ان میں ارض وسماں کی ساری وسعتیں سمائی ہوئی ہیں۔توجہ طلب ہے کہ پرانی دہلی کے معروف حکیم ہمدرد صاحب نزلہ اور پرانی کھانسی جیسی جاں گداز بیماریوں سے نجات کے لیے حیدرآبادی پایہ تجویز کرتے تھے۔تحقیق طلب نکتہ ہے کہ ''ٹنڈے کباب'' کسی بیماری کی دوا ہے کہ نہیں لیکن یہ تو جگ ظاہر ہے کہ اس کے ہجر وفراق میں عاشقوں کی ایک بڑی جماعت بیمار ضرور ہوگئی ہے۔اب تو بس یہی التجا ہے کہ:

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

☆☆☆

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

رومیو کی آزمائش

آج کل یوپی میں پھولوں کی دکانیں بند ہوتے ہی پتھروں کے بازار سج گئے ہیں۔محبت کی بانسری کی جگہ اُسترے کا چلن بڑھ گیا ہے۔نفرت کے سوداگر ہر سو معصوم دلوں پر پتھر پھینکنے کے فراق میں ہیں۔نئی نسل کے رومیوں کی راہوں میں سانپ بچھو چھوڑے جارہے ہیں۔دراصل "Anti Romio Squad" محبت کے بلبل کو پنجرے میں قید کرنا چاہتی ہے۔پولیس محکمہ اپنی تمام تر ذمہ داریوں سے دست بردار ہوکر رومیو کی تلاش میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رہا ہے۔رومیو کو شہر بدر کرنا حکومت کے ایجنڈے میں شامل ہے۔پچھلے دنوں کسی بزرگ وکیل نے یہ کہہ کر ایک نیا طوفان برپا کر دیا کہ رومیو نے جولیٹ سے محبت کی تھی اور اسی کے لیے ہی جام شہادت نوش فرمایا تھا جبکہ بانسری والے کرشن کنہیا تو گوپیوں کو صبح و شام چھیڑنے میں مشغول رہتے تھے۔شکر ہے کہ مرلی منوہر اس کلیگ میں نہیں ہیں ورنہ ان پر یوپی پولیس کا قہر نازل ہونا یقینی تھا۔

عظیم ترین مغربی ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر نے اپنے شاہکار ڈرامہ "Julius Caesar" میں محبت اور قربانی کی نایاب مثال پیش کی تھی۔اس ڈرامے کے کردار رومیو اور جولیٹ آج بھی دنیا بھر میں خلوص و محبت کی روشن مثال ہیں۔یہ کردار نوجوانوں کے دلوں میں محبت کی آگ بھڑکانے کے علاوہ اسے گیلی لکڑی کی طرح سلگانے کا کام بھی

ٹنڈے کباب ═══ ڈاکٹر محبوب حسن

کرتے ہیں۔رومیو اپنی معشوقہ جولیٹ کے ہجر میں اپنی جان دینا عین سعادت سمجھتا ہے۔لیکن سات سمندر پار اتر پردیش میں اس پر بدنامی و ذلت کی مہر لگا دی گئی ہے۔مزے کی بات ہے کہ اسے گرفتار کرنے کے لیے سو سو جتن کیے جارہے ہیں۔

رومیو کی پہچان کے لیے چند ظاہری نشانیاں متعین کی گئی ہیں تاکہ دیکھتے ہی اس کے گلے میں گرفتاری کا پھندا ڈالا جا سکے۔لیکن عشق کے دشمنوں کو بھلا کون سمجھائے کہ محبت کو نفرت کی زنجیروں میں قید کرنا دیوانے کے خواب کی مانند ہے۔انارکلی سلیم، شریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا اس کی عبرت ناک مثالیں ہیں۔ناموافق حالات میں بھی محبت کی چنگاری شعلہ صفت بن جاتی ہے۔ظلم کا سمندر محبت کی آگ کو بجھا نہیں سکتا۔سرحدیں اسے روک نہیں سکتیں۔محبت کا جذبہ تیر و تفنگ اور بم و بارود سے بھی ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔یہ سچ ہے کہ ہندوستانی رومیو صبر آزما دور سے ضرور گزر رہا ہے۔لیکن اس کی آہ و فغاں سے آسمان بھی لرزاں ہے۔

حکومت کے اس قدم سے William Shakespeare کی مشرقی تفہیم کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔اپنے لازوال کردار رومیو کی رسوائی کے باوجود مرحوم شیکسپیئر کی روح نے گھی کا چراغ جلایا ہوگا کہ سنگ دل زمانے نے اسی بہانے شدت سے یاد تو فرمایا۔یوپی میں ہر شخص کی نوک زبان پر رومیو کا ذکر ہے۔اخبارات چہ میگوئیوں سے لبریز ہیں۔کتب فروش گھی کے چراغ جلا رہے ہیں۔کیوں کہ "Julius Caesar" کی بوسیدہ کاپیاں تیزی سے فروخت ہو رہی ہیں۔بعض لوگوں کو رومیو سے شدید ہمدردی ہے تو بعض اسے کوسنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

کشمکش کے اس ماحول میں یوپی کے شوہر حضرات پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہیں۔اس لاغر مخلوق پر عجب سی دہشت طاری ہے۔نکاح نامہ کے بغیر اپنی سگی بیوی کے ساتھ بھی گھر سے نکلنا باعث گناہ ہو گیا ہے۔خوف ایسا کہ اپنی بیوی کو محبت کی نظر سے

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

دیکھنا بھی برم ہوگیا ہے۔کیوں کہ کسی لمحے اگر غلط فہمی سے دھر لیے گئے تو رہائی کے لیے سسرال والوں کی گواہی لازمی قرار پائے گی۔کوئی چار روز پہلے کی بات ہے، پڑوس کے فدّن میاں اپنی اہلیہ کے ہمراہ سالے کلّن کے ولیمے میں شرکت کی غرض سے نکلے ہی تھے کہ ریلوے اسٹیشن کے پاس دھرے گئے۔ہزار منت سماجت کے بعد بھی جناب والا کی رہائی ممکن نہ ہوسکی۔فدّن میاں کے خسر کو تھانہ پہنچنے میں کافی تاخیر ہوگئی۔ایسے میں کلّن کا ولیمہ بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ حکومت کے اس ظالمانہ فرمان سے بے چاری نئی نویلی دلہنوں کی بیش قیمتی حسرتیں خاک ہورہی ہیں،تمنائیں جھلس رہی ہیں۔خواب کی تعبیر ادھوری سی ہے۔شاپنگ مالوں، ہوٹلوں،سنیما گھروں اور پارکوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔میرا خیال ہے کہ حکومت کے اس فیصلے سے مجازی خداؤں کو فضول خرچی سے بچنے کا ایک کارگر بہانہ ہاتھ آ گیا ہے۔

دلچسپ بات ہے کہ شوہروں کی طرح بھائی بھی اپنی بہنوں کے ساتھ گھر سے نکلنے میں گھبرانے اور کترانے لگے ہیں۔بہنوں کی لاکھ منت سماجت کے باوجود انھیں اطمینان نہیں۔بھائیوں کو اس بات کا ڈر ستانے لگا ہے کہ کہیں رومیو سمجھ کر پولیس انھیں گرفتار نہ کر لے۔ایسے میں بھلا کون مفت کا خطرہ مول لے۔اخبارات میں گرفتاری کی ایسی دلچسپ ومضحکہ خیز خبریں مسلسل شائع ہورہی ہیں۔بورڈ امتحانات کے اس موسم میں خواتین کو خاصی دشواری ہورہی ہے۔کیوں کہ بھائی اپنی بہن اور شوہر اپنی بیوی کے ساتھ جانے کو ہرگز تیار نہیں۔

ایسے میں روزِ محشر جیسے حالات پیدا ہوگئے ہیں یعنی کوئی کسی کا نہ رہا۔اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ خود اٹھانا ہے۔بعض شہروں میں اینٹی رومیو اسکوائڈ نے بھائیوں اور بہنوں کو ہی گرفتار کرلیا۔لاکھ گڑگڑانے اور سمجھانے کے باوجود انھیں تھانہ لایا گیا۔ثبوتِ کاملہ پیش کرنے کے بعد ہی ان کی رہائی ممکن ہوسکی۔زمانۂ قبل میں والدین اپنی

www.urduchannel.in

صاحبزادیوں کے دیر سے گھر پہنچنے پر پریشان ہوجاتے تھے لیکن انھیں اب اپنے صاحبزادوں کی فکر زیادہ بے چین کرنے لگی ہے کہ کہیں گرفتار تو نہیں ہوگیا۔

میرے خیال سے اترپردیش پولیس محکمے سے ایک بڑی چوک ہوئی ہے۔ اسے رومیو کا Sketch جاری کرنا چاہیے تھا تا کہ غلط فہمی کا ذرہ برابر بھی اندیشہ ہی نہ ہو۔ میرٹھ میں ایک پولیس والے نے تو اس بات کا دعوی کرڈالا کہ وہ ہجوم میں بھی رومیو کی اولادوں کو پہچان سکتا ہے۔ایسے میں یوپی پولیس کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔افسوس کہ اگر پولیس والوں نے اپنی اس بے پناہ قابلیت کا استعمال جرائم کی دنیا میں کیا ہوتا تو یہاں کی تصویر کچھ اور ہی ہوتی۔ یہاں کی انتظامیہ کے ذریعہ رومیو کی چند نشانیاں بھی بتائی گئی ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

لمبے اور گھنے بال والا شخص رومیو ہوسکتا ہے۔وہ خواتین کے اسکول اور کالج کے آس پاس کسی سیاّرے کی مانند گردش کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔رومیو کار یا موٹر سائیکل کا استعمال کرسکتا ہے۔وہ سگریٹ اور پان کا بھی شوقین ہے۔علاوہ ازیں آنکھوں پر کالا چشمہ اور جنس پینٹ میں ملبوس سر راہ لڑکیوں کو گھورنا اور اناپ شناپ بکنا اس کی خصلت میں شامل ہے۔ وہ خواتین کو دیکھ کر اشارے کرتے ہوئے فلمی نغمے گنگنا سکتا ہے۔کبھی کبھی وہ کسی سنسان جگہ پر تنہا بھی مل سکتا ہے۔اسے خاموش رومیو کا نام دیا گیا ہے۔ایسے دشوار تر حالات میں پیدائشی شریف لوگوں نے ان عادات واطوار کو قصداً ترک کر دیا ہے تا کہ پیش آنے والی آفت ناگہانی کو ٹالا جا سکے۔بعض ایک نے تو اپنی حفاظت کے مقصد سے سر تک منڈوالیا ہے۔خوش آئند بات ہے کہ اسی بہانے یوپی میں پرانی تہذیب وتمدن یعنی لنگی، دھوتی اور پاجامے کو نئے سرے سے فروغ حاصل ہورہا ہے۔

یاں واں ہر طرف بے قصور رومیو کی ذلت ورسوائی عام سی بات ہے۔اس کی راہوں میں پھول کی جگہ کانٹے بچھائے جارہے ہیں۔اس پر پتھر پھینکے جارہے ہیں۔اس

کا سارا جسم زخم سے چھلنی ہے۔ درد بھی حیران و پریشان کہ آخر کہاں سے اٹھے!! آنکھوں سے اشک کے بجائے لہو جاری ہے۔ دراصل عشق کی اس منزل پر لہو رومیوں کی رگوں میں دوڑنے پھرنے کا قائل نہیں رہا۔ اس کی عزت و عظمت کو سر بازار نیلام کیا جا رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر دل غمگین اور آنکھیں اشک بار ہوئی جاتی ہیں۔ لیکن کیا کہیے؟ رسوائی اور قربانی تو محبت کا مقدر ہے۔ یہی تو اس کی معراج ہے۔ انار کلی راہِ محبت میں ہی دیوار میں زندہ چنوائی گئی۔ مجنوں نے اپنی لیلیٰ کے لیے عرب کے تپتے صحراؤں میں خود کو دفن کر دیا۔ شریں کی محبت میں پہاڑ کاٹ کر فرہاد نے جوئے شیر جاری کیا اور تیشے سے اپنی جان دے دی۔ شاہجہاں نے اپنی ممتاز کی یاد میں تاج محل جیسی بے مثل عمارت تعمیر کی۔ تاریخ کے اوراق ایسی عظیم مثالوں سے معمور ہیں۔

جی ہاں! محبت تو پرخار وادی ہے، پھولوں کا سیج نہیں۔ یہاں ہر پل جھلسنا پڑتا ہے۔ خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ یاد رہے کہ عاشقوں کی آنکھوں میں نیند نہیں ہوتی۔ راہ عشق میں شب گزاری فرض ہے۔ یہاں ہجر و فراق میں بھی وصال کا لطف ملتا ہے۔ میرؔ بھی محبت کے اندھے کوئیں میں برسوں قید رہے۔ ان کا دل کباب کی طرح جلتا رہا۔ انہوں نے غالبؔ کی مانند کبھی بھی دل ناداں پر سوال نہیں اٹھایا۔ اسی لیے میرؔ کی شاعری عشق کے تنور میں تپ کر کندن بنی۔ وہ بھی تاعمر بے خوابی کا شکار رہے۔ اسی لیے تو کہا کہ ”اس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں۔“

واضح رہے کہ عشق وجنوں کی اپنی شریعت و شعریات ہوتی ہے۔ اس میں دماغ کا دخل سراسر کفر ہے۔ اس بھاری پتھر کو اٹھانا مصلحت پسندوں کے بس کا روگ نہیں۔ میخانۂ عشق میں ایک چلّو میں الّو ہونے والوں کی عافیت و عاقبت دونوں کے بگڑ جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ حضرتِ جگر نے بجا طور پر عشق کو آگ کے دریا سے تشبیہہ دی ہے۔ مفتیانِ عشق کے مطابق آگ کی چنگاری سے ڈرنے والوں پر عشق حرام ہے۔ شعلوں

ٹنڈے کباب ═══ ڈاکٹر محبوب حسن

میں نہانے والے ہی اس کے سچے وارث ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ آتشِ نمرود میں عشق نے ہی بے خطر چھلانگ لگائی تھی جبکہ عقل دور سے صرف تماشا دیکھتی رہی۔

جی صاحبان! رومیو میں مذہب عشق کے سارے ارکان موجود تھے۔ لیکن یوپی کی سرزمین اس کے لیے تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ عقیدت اور وفاداری کے یہاں کی سرزمین بنجر ہو گئی ہے۔ رومیو کی موت کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اس کے جنازے کی تیاریاں چل رہی ہیں۔ خدا رحم کرے! ملک کے دوسرے صوبوں میں بھی رومیو کی موت پر فاتحہ خوانی کی رسم جاری ہے۔ ہر طرف نفرت کا بول بالا ہے۔ سانپ اور بچھو انسانی معاشرے سے سخت نالاں و ناراض ہیں۔ ہماری حرکتوں پر گرگٹ بھی شرمندہ ہے۔ آج کل چڑیا گھروں کے جانور بھی سیاست کا شکار ہو گئے ہیں لیکن ”کوئی امید بر نہیں آتی / کوئی صورت نظر نہیں آتی“

اے محبت کے پیغمبر رومیو! ہرگز اداس نہ ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ تم نے اٹلی سے یوپی تک کا سفر طے کر لیا ہے۔ تم نے آبِ حیات پی رکھی ہے۔ تم ہزاروں برس تک سلامت رہو گے۔ جولیٹ کی محبت میں جان دے کر تم نے دنیا کو عقیدت اور قربانی کا پاٹھ پڑھایا ہے۔ زمین پر اپنی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تم نے محبت کا چشمہ جاری کیا ہے۔ تم سراپا عقیدت اور قربانی کی تصویر ہو۔ تمہاری وفاداری و صداقت کی شمع بجھ نہیں سکتی۔ تمہارے خلاف زمانے کی تمام سازشیں ناکام ثابت ہوں گی کیوں کہ تم نے نفرت و حسد کی تاریک راہوں میں خلوص و محبت کے ہزاروں چراغ روشن کیے ہیں۔ جلد ہی زمانہ تمہارے قدموں پر جھکے گا۔ بقول شاعر:

بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

☆☆☆

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

جس جلسہ میں طلبا کو میسر نہ ہو بوٹی

راقم الحروف کو اس بات کا شدید خدشہ ہے کہ کہیں آپ یہ مصرعہ مرحوم اقبالؔ سے منسوب نہ کر دیں! ہاں اگر کر بھی دیں تو کیا حرج ہے۔ کسی خسارے سے قطعِ نظر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اقبالؔ شناسی کی نئی نئی کھڑکیاں اور نئے نئے دروازے کھل جائیں گے۔ تحقیق کا ایک نیا سورج طلوع ہوگا۔ سیمینار اور جلسے کے لیے مزید راہیں ہموار ہوں گی۔ اردو زبان وادب کی خوابیدہ قسمت ایک بار پھر سے چمک اٹھے گی۔ اگر آپ یہ مضمون پڑھنے کی تھوڑی سی زحمت گوارا کرلیں تو یہ راز آپ پر بھی آشکار ہوسکتا ہے۔

حضرات! تاریخ شاہد ہے کہ سرزمینِ دہلی ہمیشہ سے ہی علم وادب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس گہوارے کے ادبی وقار وعظمت کو قائم رکھنے کی غرض سے عاشقانِ ادب ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ اس مصروفیت کے باعث بعض حضرات کو راتوں میں نیند بھی نہیں آتی۔ اگر کبھی خوش قسمتی سے آنکھ لگ بھی گئی تو نیند میں ہی تنقیدی وتحقیقی تقریر شروع کر دیتے ہیں۔ بعض حضرات کو ادبی معیار ومیزان کے زوال کا اس قدر ملال رہتا ہے کہ وہ بارگاہ خدا میں روتے اور گڑگڑاتے ہیں کہ ''اے خدا تو سارے جہاں کا خالق ہے۔ علم و ادب بھی تو تیرے ہی اختیار میں ہے۔ اے ادیبوں کے ادیب! تو میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، شبلیؔ، سوداؔ، اقبالؔ، فیضؔ، منٹو اور بیدی جیسے بڑے ادیب پیدا فرما!!!

پچھلے مہینے دہلی میں علامہ اقبالؔ پر ایک قومی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ ملک بھر سے بڑے بڑے ادیب، دانشور اور مفکر یہاں جمع تھے۔ سیمینار کے افتتاح کے فوراً بعد عجیب و غریب صورت حال پیدا ہوگئی۔ بعض حضرات نے وہاں سے فوراً سرک لینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ اس صورت حال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ایک صاحب نے تو یہاں تک سمجھ لیا کہ جلسے میں شاید اقبالؔ کی بے چین روح حلول کر گئی ہے۔ افراتفری کا عجب عالم تھا۔ دوسرے دن اردو اخبارات میں اس ہنگامہ خیز صورت حال کی دلچسپ اور مضحکہ خیز خبریں وتفصیلات جلی حروف میں شائع ہوئیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے ایک اردو اخبار میں اس واقعے کی سرخی کچھ اس طرح تھی ''قومی سیمینار میں روحِ اقبالؔ کی شرکت''۔ ایک دوسرے اردو اخبار میں اس خبر کو صفحہ اوّل پر جگہ دی گئی۔ یہاں سرخی کچھ اس طرح تھی ''قومی سیمینار اقبالؔ کے فلسفے کی زد میں''۔

ان اخبارات کی سرخیاں اور تفصیلات اس سنجیدہ معاملے کو سمجھنے میں میری خاطر خواہ مدد نہ کرسکیں۔ بات کچھ یوں تھی کے اس قومی سیمینار کے اشتہارات مختلف روزناموں میں شائع کیے گئے۔ سیمینار میں طلباء وطالبات کی شمولیت کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا۔ اخبارات کے اشتہارات پڑھ کر خاصی تعداد میں طلبا وطالبات اپنے مقالات کے ساتھ شامل ہوئے۔ سیمینار ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس ہجوم کو دیکھ کر جلسے کی کامیابی کا اندازہ لگانا ناممکن نہ تھا۔ لوگوں میں غضب کی بیداری جھلک رہی تھی۔ طلباء کی کثیر تعداد اس بات کی صاف گواہی دے رہی تھی کہ اردو کا مستقبل روشن وتاب ناک ہے۔ آنکھوں میں امید اور دل میں نیک جذبہ لیے سب کی نگاہیں اسٹیج کی جانب اٹھی ہوئیں تھیں۔

ناظم جلسہ نے سب سے پہلے تمام شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ ناظم صاحب کے ایک اعلان سے ہی اس ادبی جلسے کی ہوا نکل گئی۔ ایک ہنگامہ خیز ماحول پیدا ہوگیا۔ ایسے پر

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

آشوب عالم میں کون کس کی سنتا؟ سب کو اپنی اپنی فکر تھی۔ اپنے اپنے سپنے تھے۔ خدا جانے جلسے کو کس کی نظر لگی۔ ناظم جلسہ منت سماجت کرتے رہے لیکن کسے فرصت تھی سننے کی؟ شور وغل ایسا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ جب ماحول ذرا سنبھلا تو بزرگ ادیبوں نے طلباء کو منانے وسمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے صدر جلسہ جھٹ سے مائک پر کچھ اس طرح گویا ہوئے:

''ہم اپنی نئی نسل سے ہرگز مایوس نہیں۔ خدا کے فضل سے یہ نسل بڑی زرخیز اور ذہین ہے۔ ہمیں ان کی صلاحیت اور لیاقت پر پورا بھروسہ ہے۔ انھیں کسی خاص تربیت کی ضرورت نہیں۔ جلسے میں ہم جیسے بزرگ ادباء وشعراء کو موقع ملنا چاہیے، جن کا ایک پاؤں قبر میں لٹک چکا ہے۔ اردو کی خدمت کیلیے آپ لوگوں کے پاس تو ایک لمبی عمر پڑی ہے۔ صبر سے کام لیجیے عزیزوں۔''

ایک علمی وادبی جلسے میں ایسا قیامت خیز ہنگامہ! توبہ! توبہ!۔ خدا ایسے مقدس جلسے کو ہر طرح کی سیاسی سازش اور نظر بد سے بچائے۔ آمین! اس پرآشوب فضا کو خوش گوار بنانے میں منتظمین پیش پیش تھے۔ ہنگامے کے خاتمے کے لیے پرخلوص گزارش جاری تھی۔ دہلی میں منعقد ہونے والے ہر سیمینار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے ایک صاحب نے میرے ایک عزیز دوست سے نہایت رازدارانہ انداز میں کہا'' یہاں مرغّن غذاؤں کا بھرپور انتظام ہے۔ آپ لوگوں کو بریانی، قورمہ اور شیرمال پر قناعت کرنا چاہیے۔''

پاس کھڑے ایک دوسرے حضرت اس بات کی تائید کرتے ہوئے کہنے لگے ''بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ خدا صبر کرنے والے کو بہت پسند کرتا ہے۔'' موقع ملتے ہی بغل میں کھڑے ایک دوسرے صاحب تفصیل سے فرمانے لگے کہ:

''مجھے تو ادب برائے ادب سے زیادہ ادب برائے بریانی اور ادب

برائے قورمہ کا نظریہ زیادہ پسند ہے۔ آج کل ہر جگہ اسی نظریے کی دھوم مچی ہے۔ آخر ہماری زندگی کا بنیادی مقصد کھانا پینا ہی تو ہے۔ اگر طعام کا معقول انتظام نہ ہو تو سیمینار کی ناکامی طے ہے۔ پھر یہ کہ سیمینار میں لنچ کا اعلان ہوتے ہی کس قدر افراتفری مچتی ہے۔ محمود ایاز کی طرح سب کے سب ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں۔ ہر کسی کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔''

خیر لوگوں کی جی توڑ کوشش رنگ لائی۔ اب ماحول ذرا سنبھل چلا تھا۔ سامعین اور شرکا اپنی اپنی نشست پر دراز تھے۔ صدر جلسہ بھی ڈائس پر تشریف فرما تھے۔ طلبا صبر ایوبی کے ساتھ ہمہ تن گوش تھے۔ تبھی اچانک جلسے کی کاروائی شروع ہوئی۔ افتتاحی کلمات کے لیے ایک بزرگ دانشور ومفکر کو مائک پر مدعو کیا گیا۔ ظاہری شکل وصورت اور وضع قطع سے وہ بالکل درویش صفت انسان معلوم پڑتے تھے۔ آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ، سفید داڑھی، ہاتھ میں چھڑی، اور شیروانی میں ملبوس۔ جب وہ چشمے کے اوپری حصّے سے جھانکتے ہوئے مجمع کو خطاب کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے حضرتِ خضر نے شیروانی میں پناہ لے لی ہو!!

خدا رحم کرے!!! مہمان ذی وقار کی دانشورانہ اور فلسفیانہ تقریر سے جلسہ ایک بار پھر سے ہنگامے کی نذر ہو گیا۔ انہوں نے جیسے ہی اقبالؔ کے اشتراکی فلسفے پر اپنی پرمغز تقریر شروع کی، ایک بار پھر سے خاموش مجمع انقلاب کی نذر ہو گیا۔ ہر طرف بغاوتی شرارے اٹھنے لگے۔ انقلاب کی چنگاری شعلے میں تبدیل ہو گئی۔ منتظمین حضرات کی امیدوں پر دوبارہ پانی پھر گیا۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں بڑھنے لگیں۔ چہرے کا رنگ کالا پڑ گیا۔ منتظمین کے منع کرنے پر بزرگ دانشور کو اپنی تقریر ادھوری چھوڑنی پڑی۔ دوران تقریر انہوں نے اقبالؔ کے مندرجہ ذیل اشعار بھی پڑھے:

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

مندرجہ بالا انقلابی اشعار کو سنتے ہی طلبا مضطرب و بے چین ہو اٹھے۔ان کا خوابیدہ ضمیر شاید پھر بیدار ہو گیا تھا۔مردہ باد اور زندہ باد کے نعروں سے جلسہ گاہ گونج اٹھی۔چاروں طرف افراتفری کا عالم تھا۔صدر جلسہ چلاتے رہے لیکن یہ قیامت اب رکنے والی نہ تھی۔طلبا کے اس انقلابی رویے سے خوف زدہ منتظمین حضرات نے وہاں سے بھاگ نکلنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔اس بھاگم بھاگ کے بعد سیمینار ہال میں صرف طلبا ہی بچے تھے۔ ہنگامے کے باعث کافی تاخیر ہو چکی تھی۔دن کے دو بج چکے تھے۔ جلسہ گاہ کے ٹھیک پیچھے ظہرانہ تیار تھا۔مرغن غذاؤں کی پر لطف خوشبو نے طلبا کے انقلابی رویےّ میں ذرا لچک پیدا کر دی تھی۔دراصل شدید بھوک بھی اس ہنگامے کے لیے کچھ حد تک ذمہ دار تھی۔محفل ایک بار پھر سے آراستہ ہوگئی۔ ہر طرف خوشی و امید کا ماحول تھا۔ طلبا نے اسٹیج سے ذہنی آزادی اور اپنی بیدارئِ خودی کا اعلان کیا۔آخر میں علامہ اقبالؔ کی اشتراکی نظمیں اجتماعی طور پر پڑھی گئیں۔آخر میں طلبا فتح کا علم بلند کیے مندرجہ ذیل اشعار پڑھتے ہوئے سیمینار ہال سے روانہ ہوئے۔

جس جلسہ میں طلبا کو میسر نہ ہو بوٹی
اس جلسہ میں ایک ایسا ہی ہنگامہ مچا دو
سن کہ اب بزم ادب کا اور ہی انداز ہے
دلی اور لکھنؤ میں تیرے دور کا آغاز ہے

☆☆☆

www.urduchannel.in

ٹنڈے کباب ═══ ڈاکٹر محبوب حسن

''آخر ایک دن جو اپنی گم نامی کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ قصور اپنا ہی ہے۔ادبی رسائل میں لکھنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔اول تو ادبی رسائل کی اشاعت ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر انھیں خریدتا اور پڑھتا کون ہے؟ چند شعرا اور ادبا جنھیں رسالہ مفت بھجوایا جاتا ہے، یا کالج کے کچھ ذہین طلبہ جنھیں غزلیں اور نظمیں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے۔دراصل ادبی مضامین خشک بھی تو اتنے ہوتے ہیں کہ ان کے عنوانات پڑھنے کے بعد ہی لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف عوامی رسائل ہی میں لکھا کریں گے.....''

— کنھیا لال کپور

www.urduchannel.in

میرے اللہ پی ایچ ڈی سے بچانا مجھ کو

یہ بات سمجھ سے پرے ہے کہ پی ایچ ڈی جیسی پر عظمت ڈگری باعث ذلت و رسوائی کیسے ہوسکتی ہے؟ عمر عزیز (جوانی) صرف کر کے حاصل کیا گیا یہ نادر تمغہ کسی کے لیے بوجھ کیوں کر ہوسکتا ہے؟ جگ ظاہر ہے کہ پی ایچ ڈی انسانی وقار میں اضافے کے ساتھ ساتھ امید و کامیابی کے ہزارہا چراغ روشن کرتی ہے۔ میری ناقص معلومات کے مطابق مذہبی صحیفوں میں کہیں بھی پی ایچ ڈی کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی آخرت میں اس ڈگری پر کوئی وعدہ ہے۔ لیکن غور و فکر کا مقام ہے کہ خدا کی ذاتِ پاک سے نا امیدی سراسر کفر ہے۔ اگر مولیٰ کی نگاہ کرم پڑ گئی تو اسی ڈگری کے سہارے آخرت کا بیڑہ پار بھی ہوسکتا ہے۔ شرط یہ کہ دیانت داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے!! لیکن افسوس کہ آج کل دانش گاہوں میں پی ایچ ڈی کی بے حرمتی عام ہے۔ پی ایچ ڈی کی شان میں گستاخی کرنے والے حضرات کو جنم جنم تک اس کی روحانی خوشی میسر نہیں آسکتی۔

پی ایچ ڈی سے وابستہ ایک مسئلے نے مجھے آج کل شدید ذہنی الجھن میں مبتلا کر رکھا ہے۔ درحقیقت واقعہ کچھ یوں ہے کہ میرے علاقے میں حکیم عظمت نامی ایک صاحب ہیں۔ آس پاس کے علاقے میں انھیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ حکیم عظمت کو احتراماً ڈاکٹر صاحب کے لقب سے بلاتے ہیں۔ جانے کیوں

www.urduchannel.in

پچھلے چند برسوں سے وہ اپنے دوست احباب سے بھی دور دور رہنے لگے ہیں۔ ہر وقت ایک ازلی سی اداسی و مایوسی کی چادر اوڑھے گوشۂ تنہائی میں پڑے رہتے ہیں۔ لوگوں سے ملنے جلنے میں انھیں جانے کیوں اس قدر گھبراہٹ سی ہونے لگی ہے۔ پچھلے ہفتے ان سے میری ملاقات ہوئی۔ علیک سلیک کے بعد میں نے نہایت مہذب انداز میں حضرت کی خیر و خبر لی۔ رسمی گفتگو کے بعد جب میں نے موصوف کی گہری اداسی کی وجہ دریافت کی تو وہ مجھ پر ہی خفا ہو گئے اور بے حد سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوئے'' جناب والا! خدا کے لیے اس منحوس مسئلے کو نہ چھیڑیے'' ان کی بات راقم الحروف کی سمجھ سے باہر تھی۔ لیکن ان کی دکھتی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے میں جب دوبارہ ان سے مخاطب ہوا تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ انہوں نے حالات کی ستم ظریفی کو اتنے درد آمیز انداز میں بیان کیا کہ میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔

بات کچھ یوں تھی کہ طالب علمی کے زمانے میں حضرت پڑوس کی ایک بڑھیا کو اکثر تنگ کیا کرتے تھے۔ ان کی شرارتوں سے پریشان ہو کر وہ ان سے نالاں رہتی تھی۔ کبھی کبھی بددعائیں بھی دیتی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بڑھیا کی ناراضگی کا آپ کی اداسی اور مایوسی سے بھلا کیا تعلق ہے؟ اتنا پوچھنا تھا کہ ان کی آنکھیں دوبارہ آبدیدہ ہو گئیں۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ جیسے ساری دنیا کے درد و غم نے ان کے سینے میں پناہ لے لی ہو! میں نے ذرا ڈھارس بندھائی تو سسکتے ہوئے گویا ہوئے کہ'' میرے پڑوس کی وہ بڑھیا حالت ناراضگی میں مجھے پی ایچ ڈی کرنے کی بددعائیں دیتی تھی۔ اس وقت مجھے بڑھیا کی بددعاؤں کی تاثیر کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ ان کی تاویل سنتے ہی مجھے حیرت ناک ہنسی آئی لیکن خود کو ضبط کرتے ہوئے خاموش رہا۔

جب ماحول ذرا سنبھلا تو میں نے کہا کہ بھلا یہ بھی کوئی بددعا ہے! میری باتوں کا جواب دیتے ہوئے موصوف فرمانے لگے کہ مجھے بھی اس بڑھیا کی نیت کا اندازہ نہ تھا

لیکن آج میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسی کی بددعاؤں کے باعث آج میں ہر جگہ ذلیل وخوار ہو رہا ہوں۔اس بڑھیا کی بددعا لگتی اور نہ ہی میں پی ایچ ڈی کے پھندے میں گرفتار ہوتا۔حضرت کی گفتگو سن کر میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔میرے اندر ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ذرا توقف کے بعد میں نے کہا’’ارے حضرت! آپ یہ کیا اناپ شناپ بک رہے ہیں؟ ماشاءاللہ! اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہونا تو بڑی قسمت کی بات ہے۔ خدا اس خزانے سے ہر کسی کو نہیں نوازتا۔مجھے تو آپ پر رشک ہے۔‘‘

سلسلۂ کلام جب آگے بڑھا تو حکیم عظمت صاحب نے اپنے درد وغم اور ناکامی ونامرادی کی چادر میرے سامنے تان دی اور مجھے بے ساختہ گلے لگا لیا۔وہ سسکتے ہوئے کہنے لگے’’میری عمر تقریباً چالیس کے پار ہو چلی ہے لیکن نہ خدا ملا اور نہ ہی وصالِ صنم۔میری زندگی اب ایسے جزیرے میں پھنس چکی ہے کہ اب مجھے ریشم کی زنجیر بھی میسر ہونے کی صورت نظر نہیں آتی۔کیوں کہ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی میں بے روزگار ہوں۔‘‘ ایک بار ان کے سامنے عجیب مشکل پیش آ گئی تھی۔وہ اپنے ایک رشتہ دار کے یہاں گئے ہوئے تھے۔ان کے رشتہ دار بھی انھیں احتراماً ڈاکٹر ہی کہتے تھے۔یہ الگ بات کہ عظمت حکیم صاحب کو انجکشن لگانے کا سلیقہ بھی نہ آتا تھا اور نہ ہی انھیں دو چار دواؤں کا نام ٹھیک سے معلوم تھا۔جب پاس پڑوس میں ایک ڈاکٹر کی موجودگی کی خبر پھیلی تو دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ جمع ہو گئی۔جتنے لوگ اتنے امراض! کوئی گھٹنے کے درد سے پریشان تھا تو کسی کو قبض کی شکایت تھی۔کسی کو دل کے دھڑکنے سے تکلیف تھی تو کوئی سر کے چکرانے سے نڈھال تھا۔موصوف بہت گھبرائے کہ لوگوں کو کیسے سمجھایا جائے کہ میں صرف نام کا ڈاکٹر ہوں۔آخر کار آلہ، انجکشن، تھرمامیٹر اور دوسری ضروری چیزوں کے بہانے انھیں کسی طرح نجات ملی۔اس واقعہ کے بعد حکیم عظمت صاحب نے اپنے رشتہ داروں کے یہاں بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔

وہ ڈگری حاصل کرنے کے کئی برسوں تک ملازمت کے لیے کوشاں رہے۔پیر فقیر کے مزارات پر بھی حاضری دی لیکن ان کی مراد پوری نہ ہو سکی۔ان کے سامنے اندھیروں کا کبھی نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ قائم تھا۔نامرادی کے باوجود ان کے دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن ضرور باقی رہتی۔زندگی کی گاڑی اداس راہوں پر سست رفتاری سے چل رہی تھی۔زندگی کی خوشیاں اور حسرتیں آہستہ آہستہ دم توڑ رہی تھیں۔اب اہل خانہ بھی دھیرے دھیرے بے اعتنائی برتنے لگے تھے۔غم واداسی کا سایہ ہر وقت ان کے ساتھ ساتھ رہتا۔شادی اور نوکری کے سوالات بچھو کی طرح انھیں ڈنک مار رہے تھے۔ایسے ذلت آمیز سوالات پر وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ایسے موقع پر وہ اکثر خاموشی اختیار کر لیتے۔لیکن کبھی کبھی جھنجھلاہٹ میں جھگڑے کی نوبت بھی آ جاتی۔

حکیم عظمت اپنی اس ناکامی وبدنصیبی کا اصل ذمہ دار کبھی حکومت تو کبھی اس منحوس بڑھیا کو ٹھہراتے۔خدا رحم کرے!! شدید احساس کمتری کے سبب ان کے دل میں کبھی کبھی خودکشی کا بھی خیال آتا۔ڈگری ایوارڈ ہونے کے پانچ سات برسوں تک وہ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا لاحقہ جوڑنے میں یک گونہ فخر محسوس کرتے تھے۔ان کے علاقے میں دور دور تک ایسی بلند مرتبہ ڈگری شاید ہی کسی اور کے پاس تھی۔حکیم عظمت صاحب کی اس انفرادی شان پر اچھے اچھے رشک کرتے۔پی ایچ ڈی سے ان کی جانے کتنی خوشیاں اور نہ جانے کتنے خواب وابستہ تھے!! لیکن ستم ظریفی یہ کہ سب کچھ دیوانے کا خواب ثابت ہوا۔سچ پوچھیے تو عالم بدحالی میں یہ ڈگری ان کے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھی۔اپنا درد وغم بیان کرتے ہوئے حضرت گویا ہوئے’’پی ایچ ڈی کی اس تباہ کن ڈگری کے باعث میں دین اور دنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔‘‘ وقت کا بے رحم چہرہ موصوف سے زندہ رہنے کی امید بھی چھین لینا چاہتا تھا۔رسوائی کے ڈر سے انھوں نے اب اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگانا بھی چھوڑ دیا۔

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

پچھلے سال ان کے ایک خاص دوست کریم نواز صاحب کی شادی تھی۔دعوت نامہ ملتے ہی حضرت بارات میں نہ جانے کا بہانہ بنانے لگے تھے۔لیکن دوست کے مزید اصرار پر انھیں چاروناچار جانا پڑا۔لوگوں کی نظروں سے بچنے کے فراق میں وبس کی بالکل پچھلی سیٹ پر ہی دراز ہوئے۔بارات کے منزل پر پہنچنے کے بعد بھی وہ سب سے الگ تھلگ ٹہلتے رہے۔اسی کشمکش میں انھیں ڈیز سے بھی محروم ہونا پڑا۔وہ پوری رات بھوک کی شدت سے بے حال رہے۔انھیں رات میں سکون سے نیند بھی نہ آسکی۔خدا کی پناہ! صبح ہوتے ہی ایک اور مشکل باہیں پھیلائے سامنے کھڑی تھی۔کسی ڈاکٹر کی موجودگی کا پتہ چلتے ہی انھیں یہاں بھی مریضوں کی جماعت نے گھیر لیا۔

جی صاحبو!! سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔یعنی جتنے منھ اتنی باتیں! کسی نے ان کی ڈسپنسری کے بارے میں پوچھا تو کسی نے اختصاص کے متعلق سوال کیا۔پاس کی چارپائی پر بیٹھے ایک عمر رسیدہ بزرگ نے اپنے گھٹنے سہلاتے ہوئے کہا کہ ”بیٹا! آج کل میں اپنے کولہوں کے درد سے بہت تکلیف میں ہوں۔“ بغل کی کرسی پر بیٹھے کریم نواز کے بہنوئی حضور نے اپنی پرانی کھانسی کی شکایت درج کرائی۔اتنے سارے غیر متوقع سوالات سن کر موصوف بوکھلا اٹھے۔ان کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔اضطرابی کیفیت سے ان کے دل کے دھڑکنے کی رفتار تیز ہو اٹھی۔اس صبر آزماء گھڑی میں لوگوں کو سمجھانے کی کوئی مناسب ترکیب ان کے ہاتھ نہ آسکی۔لیکن ایک لمحے کے بعد انھوں نے کہا کہ ”میں انسانوں کا نہیں بلکہ حیوانوں کا ڈاکٹر ہوں۔“ اس آفت کے بعد انھوں نے کسی بھی شادی بیاہ میں شامل نہ ہونے کی قسم کھالی۔

سال بھر پہلے فروری کے مہینے میں صوبائی الیکشن کا ماحول اپنے پورے شباب پر تھا۔ہر طرف ریلیوں اور جلوس کا اہتمام زوروں پر تھا۔کاغذ کے ٹکڑے اور انگور کی بیٹی کی تقسیم کا سلسلہ دن کے اجالے میں بھی جاری تھا۔گویا نیتاؤں نے سر پر آسمان اٹھا رکھا

www.urduchannel.in

تھا۔حکیم عظمت صاحب کے علاقے میں فروری کی پندرہ تاریخ کو منعقد ہونے والے سیاسی جلسے میں کسی مرکزی وزیر کو شریک ہونا تھا۔ہفتے بھر پہلے سے ہی تیاریاں جاری تھیں۔وزیر صاحب کے دیدار کے لیے بازاروں اور آس پاس کے دیہی علاقوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ صبح سے ہی موجود تھے۔لال بتی والی مہنگی کار سے وزیر کے اترتے ہی سیاسی نعروں سے فضا میں ہلچل سی مچ گئی۔ڈاکٹر حکیم عظمت صاحب بھی غم و اداسی کا بوجھ لیے مجمع میں شریک تھے۔لوگوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ماحول دیکھ کر گمان گزرتا کہ ہمارا ملک تڑ سے ترقی کرنے والا ہے۔وزیر کے ڈائس پر تشریف لاتے ہی تالیوں کی آوازیں فضا میں پھیل گئیں۔شامیانے میں موجود لوگوں کا جم غفیر دیکھ کر وزیر صاحب کے چہرے پر فاتحانہ چمک کھل اٹھی۔جلسے کے افتتاح کے بعد فوراً وزیر صاحب کو تقریر کے لیے مائک پر مدعو کیا گیا۔محترم نے سب سے پہلے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور پھر پگڑی سنبھالتے ہوئے اپنی پرعزم تقریر شروع کی:

> ”بھائیو! اور بہنو! آپ لوگوں نے اپنا قیمتی ووٹ دے کر مجھے وزیر کی کرسی پر بٹھایا۔میں دوبارہ پانچ برسوں کے بعد ہی آپ کے بیچ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوں۔میرا دل آپ لوگوں سے ملنے کے لیے بار بار تڑپتا تھا لیکن ملک وقوم کے غم میں شب و روز مشغول رہا۔اس بار ہماری سرکار بننے کے بعد اچھے دن کا آنا یقینی ہے۔ہمارا ملک اب تھوڑے دن میں ترقی کرنے والا ہے۔مزدوروں اور کسانوں کا قرض معاف کیا جائے گا۔غربت و مفلسی جڑ سے ختم ہو جائے گی۔ہر گھر میں بارہ مہینے عید اور ہولی جیسی خوشیاں نظر آئیں گی۔حکومت کی جانب سے ریلوے اسٹیشنوں پر مسافروں کو مفت میں روٹی اور بوٹی فراہم کی جائے گی۔ہماری سرکار آنے پر آئندہ پانچ

www.urduchannel.in

برسوں میں ملک کے کسی بھی کونے میں ایک بھی بھکاری نظر نہیں آ سکتا۔ ہندوستان سے جرم کا نام ونشاں مٹ جائے گا۔ ہم اپنے دشمن چین اور پاکستان کی آنکھیں نکال کر گوٹیاں کھیلیں گے۔
ہماری سرکار جہالت اور بے روزگاری کے تئیں بہت سنجیدہ ہے۔
ہر تعلیم یافتہ شخص برسرروزگار ہوگا......

میرے مسلم بھائیوں! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اقلیتی طبقے کی فلاح و بہبود لیے خصوصی اسکیمیں چلائی جائیں گی۔ فرقہ وارانہ دنگے اور فسادات سے سماج کو جلد ہی نجات ملے گی۔ خواتین کی عصمت وعفت کے لیے خصوصی دستے تشکیل دیے جائیں گے۔
ہر طرف خوش حالی ہوگی۔ ملک کا ہر طبقہ امن وسکون سے زندگی بسر کرے گا۔ میں گئو ماتا کی قسم کھاتا ہوں کہ آنے والے وقت میں آپ سے کیے جا رہے تمام وعدے پورے کیے جائیں گے۔
مجھے سیاست سے کوئی ذاتی دلچسپی نہیں بلکہ میں آپ لوگوں کی بھلائیکے لیے ہی رات دن کوشاں ہوں۔ مسلسل فکروغم میں ڈوبے رہنے سے میرے پاس بیت الخلا جانے کا بھی وقت نہیں۔ ملک وقوم کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر رکھی ہے۔ میرے پیارے دیش واسیوں! یہ فقیر آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے ووٹ کی بھیک مانگ رہا ہے۔ آپ مجھے ایک آخری موقع......''

وزیر صاحب کی پرفریب تقریر ابھی ختم بھی نہ ہو پائی تھی کہ حکیم عظمت صاحب اندر ہی اندر ابل پڑے۔ انتہائی غصے کے باعث ان کا بدن ہلنے کانپنے لگا۔ وہ شدید جذباتی انداز میں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے ڈائس کی جانب بڑھنے لگے۔ حکیم عظمت کو اپنی

www.urduchannel.in

طرف آتا دیکھ کر وزیر صاحب نے اپنی تقریر بیچ میں ہی روک دی۔ ان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کسی انہونی کے ڈر سے ان کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا۔ موصوف کی اس حرکت سے مجمع میں گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ لوگ انھیں حیرت واستعجاب سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

حکیم عظمت نے مائک سنبھالتے ہوئے منسٹر کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ آج وہ اپنے سینے میں دفن درد وغم کے ہر ایک طوفان کو باہر نکال پھینکنا چاہتے تھے۔ آج انھیں کسی طرح کی شرم وحیا اور ذلت ورسوائی کا ذرہ برابر بھی احساس نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کی ناکامی ونامرادی کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ موصوف خاموش مجمع اور کرسی پر بیٹھے وزیر کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت جذباتی لہجے گویا ہوئے:

''میرے عزیز ہم وطنو! اس وقت میرے سینے میں جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ منسٹر صاحب! میں اس معصوم عوام کی نظروں پر پڑا پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ جھوٹ مکاری، دغابازی اور عیاری کی دکانیں بند کیجیے۔ آپ لوگوں کے کھوکھلے اور بے بنیاد وعدوں پر میں تھوکتا ہوں۔ آپ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے عوام کو کب تک ٹھگتے رہیں گے؟ آپ ہم پر احسان کرنا بند کیجیے۔ آپ جیسے لوگ ملک کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ لیڈروں کی توند مسلسل باہر نکلتی جا رہی ہے جبکہ دیش کے لاکھوں لوگ غریبی اور مفلسی کے باعث خودکشی کرنے پر مجبور ہیں۔ سیاسی رہنماؤں کی عیاشیوں کی وجہ سے ہمارا ملک دوبارہ غلام ہو جائے گا۔ ملک کا قانون چند مکار اور خودغرض لیڈروں کی

www.urduchannel.in

رکھیل بن گیا ہے۔ ملک کے طول وعرض میں ہونے والے
فرقہ وارانہ فسادات پر سیاسی روٹیاں سینکی جا رہی ہیں۔ میں
آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی یہ گھنونی حرکت
آخر کب بند ہوگی؟؟

بے روزگاری کی بات کرتے ہوئے آپ کو ذرا بھی شرم نہیں
آتی! سیاست کی ناکامی کے سبب آج ملک کا اعلیٰ تعلیم یافتہ
طبقہ بھی مزدوری کرنے پر مجبور ہے۔ بے روزگاری کے سبب
نوجوانوں کو ایک عدد بیوی بھی میسر نہیں ہو پاتی جبکہ آپ جیسے
عیاش لوگ شباب، کباب اور شراب میں سراپا ڈوبے ہوئے
ہیں۔ افسوس ہے کہ جاہل اور ان پڑھ قسم کے لوگ ملک کے
رہنما بن بیٹھے ہیں۔ انتہائی شرم کی بات ہے کہ کئی چوٹی کے
منسٹر نقلی ڈگری کی وجہ سے ذلت اور بدنامی کا کاڑھا پینے پر مجبور
ہیں جبکہ ہم جیسوں کی اصلی ڈگری بھی ناقدری کی شکار ہے۔

حکیم عظمت صاحب کی پراثر تقریر سے جلسے کا پورا ماحول غمگین ہوگیا۔ مجمع میں شامل بہت سے لوگوں کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوگئے۔ ان کی تقریر سن کر منتری جی کے ہاتھ پاؤں ہی شل ہوگئے۔ جیسے ان کے پیر سے زمین ہی کھسک گئی ہو۔ مجمع میں گرنے والے آنسوؤں کے قطروں سے منسٹر صاحب کا دل ودماغ انسانی قدروں سے لبریز ہو اٹھا۔ انھیں زندگی میں پہلی بار اپنی غیر انسانی حرکتوں پر افسوس ہوا۔ انہوں نے بھرے ہجوم میں اپنے گناہوں سے توبہ کی اور نیک جذبے کے ساتھ عوام کی خدمت کا عزم کیا۔ جب حضرت ذرا سرد پڑے تو سسکتے ہوئے بولے:

منتری جی! میں اس پورے علاقے میں ڈاکٹریٹ کیا ہوا اکیلا شخص

ہوں۔ پی ایچ ڈی نے مجھے جی بھر کے ذلیل کیا ہے۔ اس ڈگری
کی اوقات یہ ہے کہ لوگ مجھے ڈاکٹر کہہ کر چڑاتے ہیں۔ سر راہ مجھ
سے کھانسی اور کھجلی کی دوا پوچھتے ہیں۔ پروفیسری تو دور مجھے چپراسی
کی نوکری بھی میسر نہ ہوسکی۔ مزید صدمہ یہ کہ بے روزگاری کے
باعث آج تک میں کنوارا ہوں......''

حکیم عظمت صاحب کی داستان سن کر مجمع میں دوبارہ ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وفور جذبات سے حضرت کا گلا اب روندھ گیا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ان کی حالت زار دیکھ کر وزیر صاحب بھی آبدیدہ ہوگئے۔ حاضرین جلسہ کی خدمت میں عرض کرتے ہوئے حکیم عظمت صاحب نے کہا کہ ''مجھ میں مزید رسوائی برداشت کرنے کی طاقت باقی نہیں رہی۔ آپ لوگوں کی طرح میں بھی ایک عام انسان ہوں۔ اب میں ڈاکٹر نہیں بلکہ مریض ہوں اور صرف ایک مریض......

☆☆☆

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

سارے جہاں سے چوپٹ ہندوستاں ہمارا

آپ کی خدمت میں عرض کرتا چلوں کہ پیش نظر مصرعے میں لفظ اچھا کی جگہ چوپٹ دیکھ سن کر میں بھی دم بخود تھا۔ میرے دماغ کو بھی زور کا جھٹکا لگا تھا لیکن معاملے کی چھان پھٹک کے بعد صورت حال بالکل اطمینان بخش نکلی۔ ترانہ لکھتے وقت شاعر مشرق علامہ اقبالؔ کے دل و دماغ میں یقینی طور پر ایک خوبصورت اور اچھے ہندوستان کا تصور رہا ہوگا۔ لیکن وطن عزیز کے عصری پس منظر کے پیش نظر ترانہ گنگناتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ یعنی خود کو دھوکہ یا ترانے کی توہین!!

صاحبان! بات نکلی ہے تو پھر دور تلک جائے گی یعنی ''ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تیری جوانی تک۔'' ظاہر ہے کہ ہم سب ملک کے بدترین حالات کے ذمہ دار اور چشم دید گواہ ہیں۔ افسوس کہ آج ہمارا ملک ہندوستان نہ جانے کیسے کیسے خطرناک امراض کا شکار ہے۔ ہزار کوششوں کے باوجود مرض میں کوئی کمی نہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''۔ ہاں اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ اسی بہانے ملک میں ڈاکٹروں کی ایک کثیر تعداد ابھر کر سامنے آئی ہے۔ کوئی دوا کا سہارا لے رہا ہے تو کوئی انجکشن کے دم پر مرض کو قابو کرنے کا دعوی ٹھوک رہا ہے۔ لیکن ان ڈاکٹروں کے کھوکھلے وعدے کا کیا بھروسہ؟ بے چارے غالبؔ نے ٹھیک ہی کہا ہے:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

زمانہ گواہ ہے کہ آج کل اہل وطن میں امراض کے تئیں بیداری کچھ زیادہ ہی پیدا ہو چلی ہے۔ لوگ جگہ جگہ اپنے بیدار ہونے کا واضح ثبوت بھی پیشکر رہے ہیں۔ اپنے حقوق کی پامالی اور ناانصافی کا احساس رفتہ رفتہ سب کو ہو چلا ہے۔ عوام کی جدوجہد دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں کچھ اچھا ہونے والا ہے۔ انسان تو انسان جانوروں میں بھی غضب کا شعور پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے اندر بھی بیداری کی لہر سی دوڑ پڑی ہے۔ چند مہینے قبل کرپشن اور بدعنوانی کے خلاف پورا ملک آگ اُگل رہا تھا۔ گویا ہر شخص اپنے سر پر آسمان اٹھائے ہوئے تھا۔ دہلی کی تو بات ہی چھوڑیے! یہاں تو قیامت برپا تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک رہنما جنم لے رہے تھے۔ ہر کوئی مسیحائی کا دم بھر رہا تھا۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش جاری تھی۔

اس سازگار ماحول کو دیکھ کر آنکھوں میں نہ جانے کیسے کیسے حسین خواب سجائے جانے لگے تھے؟ لیکن 'خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا' کی مانند سب کچھ دیوانے کا خواب ثابت ہوا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سیاسی کشمکش کے دوران جانوروں میں بھی خودی کا شدید احساس جاگ اٹھا تھا۔ دہلی میں تو بیلوں کو احتجاج کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ رام لیلا میدان میں بیلوں کے مجمع پر بھی پولس والوں نے بے رحمی سے لاٹھیاں برسائیں۔ ملک بھر سے جمع ہوئے بیلوں نے استحصال اور ناانصافیکے خلاف باضابطہ ایک جلسے کا اہتمام بھی کیا۔ بیلوں کے سردار نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میرے عزیز بیل بھائیو! روز ازل سے ہی ہمارا استحصال جاری ہے۔ اب مزید ظلم برداشت کرنے کی قوت ہم میں نہیں رہی۔ ہماری ذات نے انسان کی خوشی و ترقیکے واسطے کتنی

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

دشواریاں اٹھائی ہیں؟ ہم نے ہی بنجر زمین کو چیر کر زرخیز بنایا۔
انسانی تہذیب وثقافت کی ایک طویل تاریخ ہمارے کندھوں
کے سہارے ہی آگے بڑھی ہے! لیکن افسوس کہ حضرتِ انسان
نے ہم بیلوں کے ساتھ تعصب کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔
نسل آدم نے گائے کو 'گئوماتا' کا خطاب عطا کیا۔خدا
انسانوں کو عقل دے!! جب گائے کو ماں کی تعظیم میسر ہوسکتی
ہے تو ہم ''باپ'' کے احترام سے کیوں کر محروم ہیں؟ گائے کو
سیاست میں بھی خاطر خواہ حصہ دیا گیا۔سوال اس بات کا ہے
کہ کیا ہمارے بغیر گائے کا وجود ممکن ہے......؟

اس بوڑھے بیل کی شعلہ بیانی سن کر بیلوں کے مجمع میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ بیلوں میں پیدا غم وغصہ قابل دید تھا۔احتجاجی وانقلابی جذبات سے معمور بیلوں کی زبان سے عجیب وغریب قسم کی آوازیں نکل رہی تھیں۔تبھی اچانک ایک دوسرے بیل نے اپنی تقریر شروع کی۔ اس نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے غیر منصفانہ رویے کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ دوسرے بیل کی باتیں ملاحظہ ہوں:

''پیارے بیل بھائیو! کتنے افسوس کی بات ہے کہ ادیبوں اور شاعروں نے بھی ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ہمیں نظرانداز کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔اسمٰعیل میرٹھی نے گائے پر کیسی پیاری نظم لکھ دی۔'رب کا شکر ادا کر بھائی/ جس نے ہماری گائے بنائی'۔انور سجاد نے بھی 'گائے' کے نام سے ایک افسانہ لکھا۔ہاں پریم چند نام کے ایک دیانت دار کہانی کار گزرے ہیں، جنھوں نے 'دو بیلوں کی کتھا' لکھ کر ہمارے ساتھ کچھ حد تک انصاف ضرور

کیا ہے۔ہم اجتماعی طور ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔''

ہم انسانوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے ہی جانوروں میں ایسی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ان کے جسم میں جگہ جگہ زبانیں اُگ آئی ہیں۔انھیں اب کسی طرح کی غلامی پسند نہیں۔اپنے حقوق کی بازیافت ان کی زندگی کا مقصد بن گیا ہے۔

سماجی، سیاسی، مذہبی، اقتصادی، علمی اور ادبی سطح پر پیدا ہونے والی بے شمار بیماریوں سے ملک کی حالت قابل رحم ہے۔ان امراض کی وجہ سے پورا معاشرہ تعفن سے بھر گیا ہے۔سوال اس بات کا ہے کہ مرض کی پہچان ہو جانے کے بعد بھی دوا کام نہیں کر رہی ہے۔کوئی ایلو پیتھک تو کوئی ہومیو پیتھک دواؤں کا مشورہ دیتا ہے۔یہ تو وہی بات ہوئی کہ جتنی منھ اتنی باتیں یعنی ''زیادہ جوگی مٹھ اجاڑ۔'' بعض حضرات کا خیال ہے کہ سیاسی رہنماؤں نے ملک کا توازن بگاڑ رکھا ہے۔لیکن اس بات پر یقین کرنا بھی تو مشکل ہے۔ ہمارے لیڈران شب وروز ملک کے غم میں اداس پڑے رہتے ہیں۔ بے چارے رات کی نیند اور دن کا سکون تج کر ملک کو چمکانے میں ہر لمحہ ہر پل مصروف عمل ہیں۔کسی کو غریب کی جھونپڑی میں دال روٹی کھاتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے تو کوئی ملک کی بھلائی کے لیے افلاک کی سیر کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔نبض شناس اکبرالہ آبادی کے درج ذیل شعر میں لیڈروں کا غم پیہم آشکارا ہے:

قوم کے غم میں ڈنر ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

بعض صاحبان کا خیال ہے کہ ملک کے نظام کو پولیس والوں نے چوپٹ کر رکھا ہے۔لیکن یہ بات خاکسار کی سمجھ سے بالاتر ہے۔کیوں کہ محکمۂ پولیس نے ملک کی بہتری اور خوش حالی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ان کے اندر خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری پولیس مجرموں کو غضب کی پھرتی سے پکڑتی ہے۔رات

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

میں بم پھٹا اور صبح تک دہشت گردوں کی گرفتاری یقینی ہے۔ دل میں یقین کامل ،نظر میں تیزی اور سینے میں خدمت کا بے پناہ جذبہ لیے انتظامیہ ملک کی تعمیر وترقی میں سرگرداں ہے۔ مجال ہے کہ پولیس والوں کی واقفیت کے بغیر کوئی پرندہ بھی پر مار دے! جوئے اور شراب کے اڈے، چوری و ڈکیتی کے امکانات اور قتل وفسادات کے اندیشے سب پر ان کی نظریں جمی رہتی ہیں۔ کئی بار تو حادثہ رونما ہونے سے قبل ہی انھیں معلوم ہو جاتا ہے۔ جیسے علاء الدین کا کوئی چراغ ان کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ جی صاحبو! ویسے ہی ان کی وردی پر میڈل و تمغے نہیں چمکتے! دہلی کی اگر بات کریں تو یہاں کی پولیس تو آئے دن کوئی نہ کوئی انوکھا کارنامہ انجام دیتی رہی ہے۔ ایک بار دہلی کی عدالت میں کسی مجرم کی پیشی تھی۔ اتفاق سے پولیس محکمہ کی جانب سے بھی گواہی ہونی تھی۔ ایک پولیس والے نے شاعرانہ انداز میں کہا:

قاتل کے طرف دار کا کہنا ہے کہ اس نے
مقتول کی گردن پر کبھی سر نہیں دیکھا

شعر سنتے ہی جج صاحب کے ہوش اڑ گئے اور ان کا سارا وجود پسینے میں غرق ہو گیا۔ پولیس والے کی اس شاعرانہ گواہی سے پوری عدالت قہقہے سے گونج اٹھی۔ خدارا! اگر ملک کی پولیس ایسے ہی کارنامے انجام دیتی رہی تو مرض اور بھی لا علاج ہو جائے گا۔ خدا انھیں عقل وشعور بخشے!!

کسی مفکر کا قول ہے کہ جس ملک کے معصوم بچوں میں بیداری پیدا ہو جائے تو سمجھیے کہ ملک صحیح راہ پر چل رہا ہے۔ اگر ہم اس مفکر کی بات کو تھوڑی دیر کے لیے مان لیں تو پیش نظر مصرعے کی حقیقت از خود عیاں ہوسکتی ہے۔ آج ملک اور زمانے کے بدتر حالات نے بچوں کی معصومیت چھین لی ہے۔ وہ پہلے جیسے بھولے نہیں رہے۔ اب ملک کے نونہال اپنے بڑوں سے آنکھیں ملا کر باتیں کرنے لگے ہیں۔ دراصل بچے وقت سے

پہلے ہی ذہنی طور پر بالغ ہو چکے ہیں۔ کسی شاعر نے سچ ہی کہا ہے:

سنبھل کر بات کرنا بزرگو
یہاں بچے پلٹ کر بولتے ہیں

بچوں کی ذہنی بیداری کے متعلق آنکھوں دیکھا واقعہ آپ کی خدمت میں پیش خدمت ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ گزشتہ سال جشن جمہوریہ کے موقع پر انڈیا گیٹ کے نزدیک کسی شاندار تقریب کا انعقاد ہوا۔ حسن اتفاق سے راقم الحروف بھی اس تقریب میں شامل تھا۔ اس تقریب کا افتتاح علامہ اقبالؔ کی معروف نظم ’’سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا‘‘ سے ہونا تھا۔ ترانہ گانے کے لیے جامعہ کے کسی اسکول سے بچوں کو لایا گیا تھا۔ تقریب کے افتتاح سے پہلے ہی دلچسپ صورت حال پیدا ہوگئی۔ عین وقت پر بچوں نے ترانہ پڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہوگئی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ’’سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔‘‘

بچوں کی اس دانستہ حرکت سے پرنسپل صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس خاص موقع پر ہندوستان کی ممتاز شخصیات کے علاوہ دیگر ممالک سے تشریف لائے مہمانان گرامی بھی شریکِ بزم تھے۔ اس حالت زار سے ہر شخص حیران و پریشان کہ ملک کے وقار کا سوال تھا!! بچوں کو سمجھانے اور منانے کی بھرپور کوششیں کی گئیں۔ لیکن بچوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ ان کے معصوم چہروں پر ناراضگی صاف ظاہر تھی۔ ایسا محسوس ہوا کہ وہ اجتماعی طور پر کوئی انتقام لینا چاہتے ہیں۔ بچوں نے ایک آواز ہو کر کہا کہ ہم اس عظیم ترانہ کی اب مزید توہین نہیں چاہتے۔

جھوٹ بولتے بولتے ہم تھک چکے ہیں۔ ہم آپ بڑوں سے یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی ہمارا ہندوستان سارے جہاں سے اچھا ہے؟ مکر وفریب اور سفید جھوٹ کا یہ سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا؟ ملک کے ہوس پرست اور لالچی لوگ غریبوں اور

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

مزدوروں کے منھ کا نوالہ چھین رہے ہیں۔افسوس صد افسوس کہ آج ہمارے نہ جانے کتنے بھائیوں کو تعلیم نصیب نہیں ہے۔اسکول جانے کی بجائے وہ مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔کیا اسی کا نام جشنِ آزادی ہے؟ کیا اسی کو جشن جمہوریہ کہتے ہیں؟ کیا انھیں اوصاف کے دم پر ہمارا ملک دنیا بھر سے اچھا ہے؟ اب بچے بھی اتنے بھولے اور معصوم نہیں رہے! آج ہمارا وطن عزیز مختلف قسم کے موذی امراض کا شکار ہے۔بسترِ مرگ پر بے ہوش پڑا اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ایسی قابلِ رحم صورت حال میں ہندوستان کی تعریف و توصیف کا ترانہ کس حوصلہ سے گایا جائے؟ میں شامیانے سے باہر نکل چکا تھا۔تبھی اچانک بچوں نے نہایت جذباتی انداز میں ترنم کے ساتھ گانا شروع کیا:

سارے جہاں سے چوپٹ ہندوستاں ہمارا
کتنے یہاں ہیں الّو ایسا چمن ہمارا
خود آپ ہی سے ہستی مٹتی ہے اب ہماری
کیوں کر رہے گا دشمن دورِ زماں ہمارا
اپنے ہی اس وطن میں حالت ہماری خستہ
ایسے میں ہم کہیں کیوں ہم جنت وطن ہمارا

☆☆☆

www.urduchannel.in

''عورتیں منی اسکرٹ پہنیں تو مردوں کی نگاہیں نیچی رہتی ہیں۔مرد کو نیچا دکھانے کے لیے اس سے آسان کوئی اور ترکیب نہیں۔''

www.urduchannel.in

▬ یوسف ناظم

ٹرین کا عبرت ناک سفر

میاں کمال بڑے ہی لاابالی قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں۔وہ آئے دن کارہائے نمایاں انجام دینے میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ان کا دماغ شیطانوں کی رہائش گاہ ہے۔ایک بار سڑک پر مچھلی تلاش کرتے وقت کسی ٹرک سے ٹکرا گئے تھے۔وہ اپنے ہم پیالہ وہم نوالہ دوستوں سے ٹرین کے سفر کی دلچسپ روداد سنا کرتے تھے۔ایک دفعہ ان کے ایک لنگوٹیا یار نے انھیں سفر کی ایک مضحکہ خیز روداد اشارے کنائے میں سنائی تھی۔وہ روداد موصوف کے لیے کسی مزیدار پہیلی سے کم نہ تھی۔میاں کمال مہینوں تک اس معاملے سے لطف اندوز ہونے کی ادھیڑ بن میں مصروف رہے۔

میاں کمال دھن کے پکے تھے۔اس پہیلی سے دو چار ہوئے بغیر چین وسکون ان کے لیے حرام تھا۔اس لیے مہینے میں دو تین بار ٹرین کا سفر کرنا ان کے لیے لازمی ہو گیا۔ایک بار ریلوے کاؤنٹر پر ٹکٹ لیتے وقت انھوں نے ریزرویشن فارم میں male کی کی بجائے غلطی سے Female لکھ دیا تھا۔کاؤنٹر پر بیٹھے اس ادھیڑ عمر شخص نے اپنے چشمے کے اوپری حصے سے جھانکتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں کہا’’جناب! آپ کہاں سے نازل ہوئے ہیں؟ کیا آپ کو زمین اور آسمان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔‘‘ یہ سنتے ہی موصوف شرماتے ہوئے بولے’’سوری! لیکن انکل آج کل ایسے نازک حالات پیدا ہو

رہے ہیں کہ بھید بھاؤ کرنے میں جیل جانے تک کا خطرہ ہے۔ہماری سرکار دونوں میں کوئی فرق نہیں مانتی۔‘‘ میاں کمال کی باتوں سے ریلوے کاؤنٹر کے پاس کا سارا ماحول قہقہے سے گونج اٹھا۔ان دنوں جون کا مہینہ تھا۔ریل گاڑیوں میں غضب کی بھیڑ تھی۔ان حالات میں کنفرم ٹکٹ حاصل کرنا لوہے کے چنے چبانا جیسا تھا۔ہزار کوششوں کے باوجود کمال صاحب کنفرم ٹکٹ سے محروم رہے۔آخر کار انتظاری ٹکٹ پر ہی صبر کرنا پڑا۔

ٹھیک اگلے دن شام کے سات بجے ان کی ٹرین تھی۔ان دنوں شہر میں غضب کی ٹریفک تھی۔لدے پھندے حضرت جیسے ہی ریلوے اسٹیشن پہنچے،ٹرینکی روانگی کا اعلان ہوا۔ٹرین چھوٹ جانے کے خوف سے جناب پہلے تو گھبرائے،پھر گرتے پڑتے کسی طرح پلیٹ فارم تک جا پہنچے۔پلیٹ فارم پر انسانوں کا ایک گھنا جنگل موجود تھا۔اس وحشت ناک بھیڑ نے انھیں اور زیادہ بے چین کر دیا تھا۔پلیٹ فارم پر شور وغل ایسا کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ پڑتی تھی۔ان کی ٹرین دائیں جانب کے پلیٹ فارم پر لگی تھی۔ایسے قیامت خیز ماحول میں انھیں اپنے دوست کی ایک بات یاد آئی۔وہ یہ کہ انتظاری ٹکٹ سے سفر کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔یہ راز آج فاش ہونے والا تھا۔

دراصل بات یہ تھی کہ انتظاری ٹکٹ کی برکت سے سلیپر کلاس کے کسی بھی ڈبّے میں گھسنے کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔شاید کمال صاحب کے دوست کی عقل اس کے گھٹنے میں اٹکی پڑی تھی۔اپنی برتھ تک پہنچنے میں اسے ہمیشہ ہی خدشہ بنا رہتا۔گارڈ نے جیسے ہی ہری جھنڈی دکھائی،ٹرین دھک سے آگے کی جانب سرکنے لگی۔پلیٹ فارم پر افراتفری کا عالم پیدا ہوگیا۔کوئی الٹا تو کوئی سیدھا بھاگتا ہوا نظر آیا۔بعض لوگ دوڑتے ہوئے کھڑکیوں سے چپک کر اپنوں کو خدا حافظ کہہ رہے تھے۔اس ہنگامے میں نہ جانے کتنے لوگ پلیٹ فارم کے فرش پر گر پڑے۔مسافروں سے دھکے کھا کر ایک پھل والے کی ٹوکری سر سے بے ساختہ گر پڑی۔اس حادثے سے ٹوکری میں رکھے ہوئے سیب،

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

کیلے، انگور اور سنترے پلیٹ فارم پر جہاں تہاں بکھر گئے۔

موصوف اس وحشت ناک بھیڑ سے خوف زدہ ہوکر پلیٹ فارم کے ایک کنارے کھڑے تھے کہ اچانک ان کے اندر ایک عجیب سی ہلچل پیدا ہوئی اور اپنا رخت سفر سنبھالتے ہوئے ٹرین پر حملہ آور ہوئے۔ٹرین کے ساتھ دوڑتے ہوئے انہوں نے اپنا بھاری بھرکم بیگ سامنے کے ایک کوچ میں اچھال دیا۔ٹرین اب بھی دھیمی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔مسافر ٹرین کے دروازوں پر مکھیوں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔حضرت کا بیگ ہوا میں لہراتے ہوئے سامنے سے گزر رہی ایک صنفِ نازک سے جا ٹکرایا۔گویا میاں کمال کی شامت ہی آ گئی۔اس رنگین فتنے سے بچ نکلنے کی گھبراہٹ میں حضرت باتھ روم میں گھس گئے لیکن ان کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔آخر کار معذرت اور منت سماجت کے بعد ہی انھیں رہائی مل سکی۔

بلا ٹلتے ہی اپنا بیگ فرش پر گھسیٹتے ہوئے جناب والا بغل کے ایک کیبن میں جا گھسے۔کوئی چالیس بیالیس سالہ نوجوان اپنی فیملی کے ساتھ کیبن میں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے حاکمانہ لہجے میں حضرت کو کہیں اور کھسکنے کا اشارہ کیا۔اس کی باتیں سن کر موصوف پہلے تو سہمے پھر ذرا توقف کے بعد سوالیہ لہجے میں کہا کہ ''کیوں صاحب! میں کسی بوتل سے نکلا ہوا جن ہوں کیا؟''اس شخص کے دوبارہ سخت ہونے پر حضرت نے وہاں سے چلے جانے کی وجہ دریافت کی۔پیشانی پر بل دیتے ہوئے اس نے کہا ''یہاں میری فیملی ہے۔''اس کی بات سنتے ہی میاں کمال صاحب زور سے ہنس پڑے۔

انہوں نے دوبارہ طنزیہ انداز میں کہا کہ ''لگتا ہے کہ جناب کو پہلی بار ٹرین کا سفر نصیب ہوا ہے۔''ذرا سی خاموشی کے بعد حضرت پھر گویا ہوئے ''اپنے پاس بھی فیملی ہے۔میں نہ تو آسمان سے ٹپکا ہوں اور نہ ہی زمین چیر کر پیدا ہوا ہوں''اس شخص کی حرکت سے موصوف اکچھ زیادہ ہی جھنجھلائے ہوئے تھے۔انہوں نے جیب سے اپنا انتظاری

ٹکٹ نکالا اور اس شخص کو دکھاتے ہوئے گویا ہوئے ''میں ٹرین کے سلیپر کلاس کی فرش پر کہیں بھی اٹھنے، بیٹھنے اور کھانسنے کے لیے آزاد ہوں۔'' یہاں سے کوئی بھی مجھے ہٹا نہیں سکتا۔حضرت کی مدلل اور بااثر تقریر سن کر وہ شخص گونگا ہو گیا۔

ریل گاڑی کے پہیے کے ساتھ ساتھ گھڑی کی سوئیاں بھی تیز رفتاری سے اپنی منزل کی جانب گامزن تھیں۔ٹرین کسی گھنے جنگل سے ہوکر گزر رہی تھی۔باہر گھُپ اندھیرا تھا۔دور دور تک کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا۔زیادہ تر مسافر نیند کی آغوش میں تھے۔کسی کی ناک سے اٹھنے والی خراٹے کی آوازرات کے ماحول کو اور ڈراونا بنا رہی تھی۔رات کے دو بجنے ہی والے تھے۔ٹرین کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔اِدھر اُدھر آنے جانے والوں کی تعداد بھی کم سے کم ہو چلی تھی۔کمال صاحب نے بیگ سے اخبار نکال کر نیچے بچھا دیا۔تیز رفتاری کے سبب ٹرین ہواؤں سے کھیل رہی تھی۔فرش پر لیٹتے ہی یکبارگی انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوں۔

اکلوتی بیوی کی نصیحت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے انھوں نے بیگ کو اپنی کمر سے کس کر باندھ لیا۔اب وہ نیند کی دیوی کے انتظار میں جی جان سے جٹ گئے۔ابھی نیند کی دیوی کا ہلکا سا لمس بھی نصیب نہ ہو پایا تھا کہ ایک دیوہیکل انسان نے لوگوں کو بے رحمی سے جگانا شروع کیا۔اس کے بے رحم تیور سے موصوف اسے کوئی لٹیرا یا ڈکیت سمجھ کر اندر ہی اندر لرز اٹھے۔بغل میں ہی نیچے کی سیٹ پر دراز ایک بزرگ کے ذریعہ پتہ چلا کہ مسافروں کو جگانے والا دیوہیکل انسان ٹی ٹی ہے۔اس بات کی کامل تصدیق ہونے کے بعد ہی میاں کمال نے راحت کی سانس لی۔موصوف نے دل ہی دل میں اسے موٹی موٹی گالیاں دیں اور بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگے کہ ''کیسا سنکی اور کھوسٹ ٹی ٹی ہے؟ بھلا ٹکٹ چیک کرنے کا یہ بھی کوئی وقت ہے۔''

بجلی کا سوئچ آن کرتے ہی کمپارٹمنٹ روشنی سے بھر گیا۔ٹی ٹی نے گہری نیند

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

میں سو رہے باقی مسافروں کو بھی چلا چلا کر جگانا شروع کیا۔لوگ آنکھیں ملتے ہوئے باری باری سے اپنا ٹکٹ ٹی ٹی سے چیک کرا رہے تھے۔سر سے چادر ہٹاتے ہی حضرت کی نظر جیسے ہی اس ٹی ٹی پر پڑی،قسم بہ خدا ان کے حلق سے ایک ہیبت ناک چیخ نکل پڑی۔انھوں نے اپنا سر جھٹ سے چادر کے اندر چھپا لیا۔دراصل انہوں نے اپنی زندگی میں آج تک اتنا کالا انسان نہ دیکھا تھا۔ایک تو کریلا دوجا نیم چڑھا۔کوئلے جیسا شوخ رنگ اوراوپر سے کالا کوٹ ۔یہ منظر ان کے لیے کسی ستم ظریفی سے کم نہ تھا!!رات کا پرہول ماحول اورمزید یہ وحشت ناک رنگ وروپ۔رات تو رات دن کے اجالے میں بھی اس ہیبت ناک چہرے کو دیکھ کر ڈر جانا کچھ مشکل نہ تھا۔کالے کوٹ میں ملبوس وہ ٹی ٹی کسی کوئلے کی کان کا ٹوٹا ہوا چٹان معلوم پڑتا تھا۔رات کے ماحول میں اسے دیکھ کر بچے گھگھیانے لگے تھے۔اس کی دھیمی آواز بھی بادل گرجنے جیسی تھی۔اس کے جاتے ہی لوگوں نے راحت کی سانس لی۔جیسے کوئی بلا ٹل گئی ہو!!

ماحول ذرا سنبھلا تو میاں کمال چادر تان کر نیند کے انتظار میں جٹ گئے۔لیکن آج ان کی آنکھوں سے نیند ایسے غائب تھی جیسے چیل کے گھونسلے سے گوشت کا ٹکڑا!پوری رات جاگنے کے باعث ان کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔بے خوابی سے ان کا پورا بدن اکڑ رہا تھا۔انھیں زیادہ اذیت پاس سے گزرنے والوں نے پہنچائی تھی۔وہ رات بھر ٹھوکریں کھاتے رہے۔ایک دفعہ تو بائیں پیر کی ہڈی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔وہ دل ہی دل میں لوگوں کو بددعائیں اور گالیاں دیتے رہے۔اس اذیت کے علاوہ وہ رات بھر مسافروں کی نظروں میں مشکوک بھی رہے۔کوئی چور یا جیب کترا سمجھ کر آس پاس کے لوگ انھیں شک کی نظروں دیکھتے رہے۔صبح کے چھ بج چکے تھے۔ہلکی ہلکی دھوپ کھڑکی کے راستے ان کی خواب گاہ میں پہنچ رہی تھی۔بیوی کی خوش نما آواز کان میں پڑتے ہی حضرت خواب سے بیدار ہوئے۔آنکھ کھلی تو میاں کمال نے خود کو اپنے بستر پر پایا!!!

☆☆☆

’’پیشانی اور سر کی حد فاصل مٹ چکی ہے۔لہذا ناک دھوتے وقت یہ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے شروع کروں۔ناک میں بذات کوئی نقص نہیں مگر بعض دوستوں کا خیال ہے کہ چھوٹے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔‘‘

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

۔ مشتاق یوسفی

قصہ ایک ادبی سیمینار کا

خدا معاف کرے!! اردو زبان کی ترقی وتنزلی کے متعلق جانے کیسی کیسی حوصلہ شکن افواہیں اور غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا جا سکتا ہے کہ اردو آخری سانسیں لے رہی ہے تو کوئی اپنی زبان سے اردو کی مرثیہ خوانی کر رہا ہے۔ غم اردو میں کوئی آنسو بہانے پر مجبور ہے تو کسی کا سکون غارت ہے۔ اردو کی فکر میں سراپا ڈوبے ہوئے بعض حضرات تعزیتی مجلس کا اہتمام کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ مایوسی میں ڈوبے ہوئے ایسے نادان وکم فہم لوگوں سے ہوشیار رہنے کی سخت ضرورت ہے۔ در اصل ان کی آنکھوں پر سیاہ پردہ پڑا ہوا ہے۔ خدا ایسے صاحبان کو عقل سلیم عطا کرے! لکھنؤ کے اس سیمینار میں شرکت کے بعد خاکسار ایسی افواہوں کو نیم کا رس پلانے میں مصروف ہے۔ اللہ مجھ سے جھوٹ نہ بلوائے! آتش وناسخ کی سرزمین پر عاشقان اردو کا ایسا ہجوم کہ کافر ایک جھٹکے میں باایمان ہو جائے!!

قصہ کچھ یوں ہے کہ "دبستان لکھنؤ کی ادبی خدمات" کے موضوع پر وہاں کسی سیمینار کا انعقاد ہونا تھا۔ حسن اتفاق کہیے یا خوبی قسمت کہ راقم الحروف ان دنوں لکھنؤ میں قیام پذیر تھا۔ صبح صبح اردو روزنامہ "اودھ نامہ" سے سیمینار کی خبر ملتے ہی راقم الحروف نے

www.urduchannel.in

امام باڑہ دیکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سیمینار کو حضرت گنج کے پاس کسی شاندار آڈیٹوریم میں منعقد ہونا تھا۔ میں حضرت گنج سے کوئی ڈھائی میل کے فاصلے پر قیام پذیر تھا۔ صبح دس بجے ہی کسی وزیر کے دست مبارک سے جلسے کا افتتاح ہونا تھا۔ اس لیے میں جلد از جلد تیار ہو کر نکل پڑا۔

شوق وجنون ایسا کہ ڈھائی میل کا سفر میں نے پیدل ہی طے کر لیا۔ زیادہ خوشی اس لیے بھی تھی کہ لکھنؤ کے عاشقان اردو کے دیدار کا شرف حاصل ہونا تھا۔ پوری عمارت پھول اور گلدستے سے سجائی گئی تھی۔ باہر اردو کے بڑے بڑے بینر اور ہورڈنگ لگائے گئے تھے۔ وہاں دیواروں پر میرؔ وغالبؔ اور آتشؔ وناسخؔ کی تصویریں بھی آویزاں تھیں۔ آڈیٹوریم کے اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ در حقیقت محبان اردو سے سیمینار ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہاں موجود جم غفیر دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے آب حیات پلائی جا رہی ہو! کرسی کی تو بات ہی چھوڑیے! آڈیٹوریم میں قدم رکھنے تک کی جگہ میسر نہ تھی۔ اہلِ لکھنؤ کی بے لوث قربانی اور پر خلوص جذبہ دیکھ کر دل کی ویرانیاں یکسر چمن زار میں تبدیل ہو گئیں۔

سچ پوچھیے تو عاشقانِ اردو کا ایسا ہجوم خاکسار نے پہلی بار دیکھا تھا۔ صورت حال ایسی کہ مجھ جیسے دارز قامت شخص کو بھی اُچک اُچک کر صدارتی خطبہ سننا پڑا۔ صدارتی خطبے کے بعد ظہرانے کا اعلان ہوتے ہی تقریب گاہ میں افراتفری مچ گئی۔ کسی انہونی کی خبر سے ہی ایسی بھگدڑ کبھی کبھار پیدا ہوتی ہے۔ اسی دھکم دھکا میں نہ جانے کتنے لوگ اوندھے منھ فرش پر گر پڑے۔ دامن صبر ہاتھوں سے پوری طرح چھوٹ چکا تھا۔ سب کو اپنی اپنی فکر تھی۔ کئی صاحبان کو گہری چوٹیں بھی آئیں۔ منتظمین حضرات کے ہزار سمجھانے کے باوجود عاشقانِ اردو رزم گاہ حیات میں صف آرا تھے۔ رزم وبزم کی کشمکش دیکھ کر مجھے نظیرؔ اکبر آبادی کی معروف نظم "روٹی نامہ" کی یاد آ گئی۔ لیکن یہاں کی افراتفری "روٹی

اور بوٹی کے باہمی اشتراک سے پیدا ہوئی تھی۔

شدت بھوک سے اپنا وجود بھی جھلس رہا تھا لیکن تہذیب کے اس شہر میں ایسی بے ادبی کرنا خود کو گوارہ نہ تھا۔ سچ پوچھیے تو صبر ایوبی کا دامن اپنے ہاتھ سے بھی چھوٹتا جا رہا تھا۔ جہد مسلسل کی رسی تھامے کسی طرح میں بھی قطار میں شامل ہوا۔ بعض صاحبان تو دھکے کھا کر میز پر رکھے مٹن قورمہ پر جا گرے۔ ستم ظریفی یہ کہ میز پر گرنے سے ایک حضرت کا سرورق ہی مرغن غذاؤں سے رنگین ہو گیا۔ سچ پوچھیے تو منتظمین حضرات بھی کم قصوروار نہ تھے۔ ایک ادبی جلسے میں لکھنؤ کا شاہی دسترخوان سجانا چہ معنی دارد؟ کسی ادبی سیمینار پر ولیمے کی شان چڑھانا بہت اچھی بات نہیں۔ ممکن ہے کہ ایسی مہمان نوازی کے پس پردہ لکھنؤ کی تہذیبی عظمت کی فکر دامن گیر رہی ہو!!

لنچ میں دنیا جہان کی مرغن غذائیں فراہم تھیں۔ چکن بریانی، مٹن بریانی، چکن قورمہ، مٹن قورمہ، ٹنڈے کباب، شامی کباب، شیرمال اور فیرنی کے علاوہ خورد ونوش کے نہ جانے کتنے نمونے موجود تھے؟ شاید پہلی بار یہ موقع ملا تھا لہذا میں نے بھی لکھنؤ کی اس پرکشش ضیافت سے بھرپور استفادہ کیا۔ لیکن کیا بتاؤں صاحبو! سب سے زیادہ بھیڑ تو ٹنڈے کباب کے ارد گرد گردش کرتی ہوئی نظر آئی۔ لوگ ٹنڈے کباب کے پاس خود بخود کھنچے چلے آتے تھے۔ کیا لذیذ اور نازک شئے تھی! زبان پر رکھتے ہی حلق میں پھسل جاتی۔ نزدیک کھڑے ایک صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے میں گویا ہوا کہ واہ ماشاء اللہ!! لکھنؤ میں تو بے انتہا بیداری ہے۔ میں گزشتہ دس برس سے دہلی میں منعقد ہونے والے ادبی جلسوں میں شریک ہوتا رہا ہوں لیکن دیوانوں کا ایسا ہجوم وہاں کے کسی بھی جلسے میں آج تک نظر نہیں آیا بلکہ کئی بار تو اشیائے خورد ونوش بچ بھی جاتی ہیں۔ بات لکھنوی تہذیب وثقافت کی تھی لہذا حضرت بے ساختہ بول اٹھے:

''میاں! دہلی میں بھیڑ کیا خاک جمع ہو گی؟ وہ شہر تو ہمیشہ ہی خستہ

حالی کا شکار رہا ہے۔ وہاں پورے بارہ مہینے بیوگی طاری رہتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دہلی سے اجڑے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کو سرزمین لکھنؤ میں ہی پناہ ملتی رہی ہے۔ دہلی کے سیمیناروں میں روکھا سوکھا کے علاوہ ملتا ہی کیا ہے؟ بہت ہوا تو بے روح بریانی رکھ دی، جس سے ایمانی جذبے کو خاطر خواہ تقویت بھی حاصل نہ ہو سکے۔ اُف! ایسی قحط زدہ بریانی سے مرغے کی ٹانگ دریافت کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں!

مقام فکر ہے کہ ایسی بے رونق وخشک بریانی پر عاشقان اردو کا مجمع کیوں کر جمع ہو؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ عصر حاضر میں 'ادب برائے فن' کے مقابلے 'ادب برائے قورمہ' کا نظریہ زیادہ مقبول ہے۔ اپنے لکھنؤ میں تو ماشاء اللہ اسی نظریے کی دھوم ہے۔ یہاں منعقد ہونے والے سیمینار کی بھنک لگتے ہی ایک روز پہلے ہی روزے رکھ لیے جاتے ہیں۔ اماں! آپ خاطر جمع رکھیے۔ میری باتوں کی تصدیق لنچ کے بعد ہونے والے دوسرے اجلاس میں خود بہ خود ہو جائے گی۔''

ظہرانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے قیلولہ کیا۔ ٹھیک ڈھائی بجے دوسرے اجلاس کی کاروائی شروع ہوئی۔ میں ڈائس کے بالکل سامنے والی کرسی پر دراز تھا۔ ناظم جلسہ سامعین سے بار بار جلسہ گاہ میں آنے کی پرخلوص التجا کرتے رہے۔ لیکن مجاہد اردو کی جماعت جستہ جستہ رخصت ہو چکی تھی۔ آڈیٹوریم اب پورے طور پر سناٹے سے ہم آغوش تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد جب میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سیمینار ہال میں صرف سات افراد موجود تھے۔ یعنی تین ڈائس پر اور چار ڈائس کے سامنے۔ تب مجھے

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں اتنی بیداری کیوں ہے! یقین جانیے پہلے اجلاس کا ہجوم دیکھ کر میری مایوسی دور ہوگئی تھی۔ میرے دل میں لکھنؤ کی ادبی انفرادیت کا تاج محل تعمیر ہو گیا تھا۔ مجھے دفعتاً ایسا محسوس ہوا تھا کہ اردو تڑ سے ترقی کرنے والی ہے۔ لیکن آج عیش وعشرت اور رنگینی وسرمستی میں ڈوبی ہوئی لکھنؤ کی مدمست زندگی کا اصل راز فاش ہوا۔

گفتگو اردو سیمینار کی ہو اور اسرار جامعی صاحب کا ذکر نہ کرنا، ادب کی شریعت میں گناہ ہے۔ موصوف دہلی میں ہونے والے اکثر وبیشتر سیمیناروں میں پرچہ تقسیم کرتے نظر آتے ہیں۔ غالباً ستر برس کی عمر، نہایت بے ضرر اور لاغر قسم کا انسان ۔ بے باک اور حق گو لیکن اللہ میاں کی گائے۔ زمانے کی بے توجہی وبے رحمی کا شکار۔ بسا بسایا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اردو کی محبت میں دہلی آ بسے اور ایک طویل مدت سے میرؔ اور غالبؔ کی سرزمین کو سینے سے لگائے رکھا۔ ان کی شرافت اور سادہ لوحی میں تلوار جیسی دھار ہے۔ انھیں دیکھتے ہی منتظمین حضرات کی سانسیں پھولنے لگتی ہیں۔ ان سے میری ملاقات کوئی دس برس پہلے دہلی کے کسی سیمینار میں ہوئی تھی۔ میں موصوف کی قلندرانہ زندگی سے بے انتہا متاثر رہا ہوں۔ اسرار جامعی صاحب کی شاعرانہ نظر میں معصومانہ شرارت بھری ہوئی ہے۔ موصوف کی زبانی ادبی سیمیناروں کی ایک دلچسپ تصویر ملاحظہ ہو:

ان سیمیناروں میں کیا محسوس ہوتا ہے ہمیں
بات آتی ہے سمجھ میں غور فرمانے کے بعد
دیکھ لیں یہ آپ بھی کہ خادم علم و ادب
کتنے تھے کھانے سے پہلے کتنے ہیں کھانے کے بعد

ارے ہاں! محترم کے متعلق ایک اور بات یاد آگئی۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ چند سال قبل دہلی میں ایک قومی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ پہلے اجلاس میں لنچ کا مقررہ وقت نکلا جا رہا تھا۔ مقالہ نگار حضرات کے خشک مقالوں کی بے رحم طوالت سامعین کے لیے ناقابل

برداشت ہونے لگی تھی۔ باوجود اس کے اہل محفل سے توجہ بنائے رکھنے کی گزارش جاری تھی۔ خدا خیر کرے! جناب صدر نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اسرار جامعی صاحب بھی اس اجلاس میں تشریف فرما تھے۔ ان کا جذبۂ صبر بھی اب ہتھیار ڈال چکا تھا۔ عالم اضطراب میں بے ساختہ ہانپتے کانپتے ڈائس تک جا پہنچے اور مائک کو اپنے اختیار میں لیا۔ بھری محفل میں سامعین کی نظریں ان کو ٹک ٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں۔ وہ مقالہ نگار حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت بے صبری وبے بسی کے ساتھ گویا ہوئے:

سنتا نہیں ہے کوئی مقالہ کسی کا اب
چھوٹی سی بات کو ہیں فسانہ کیے ہوئے
کیا دیکھتے نہیں کہ یہ کھانے کا وقت ہے
بیٹھیں ہیں سب تصور کھانا کیے ہوئے

شام کے ساڑھے سات بجے سیمینار اختتام پذیر ہوا۔ دوستوں کے اصرار پر ہم مولوی گنج کی جانب نکل پڑے۔ چہل قدمی کرتے ہوئے ہم میاں فقیر کی دکان پر جا پہنچے آس پاس کے علاقوں میں وہ اپنے نام اور کام دونوں اعتبار سے بہت مشہور ہیں۔ اوّل یہ کہ میاں فقیر کی حیات بخش چائے روح کو گرماتی ہے اور قلب کو تڑپاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ ان کے یہاں ادھار کی پرانی روایت چلی آ رہی ہے۔ مشہور ہے کہ لکھنؤ کے بڑے بڑے خاندانی رئیس آج بھی موصوف کے مقروض ہیں۔ نہ جانے کتنے تو قرض کا بوجھ لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ رئیسوں کی رئیسی اور نوابوں کی نوابی میاں فقیر کی فقیری کے سامنے بے رونق ہے۔

میاں فقیر کا نام سنتے ہی مجھے ہنسی آگئی اور میں نے اپنے دوستوں سے مزاحیہ لہجے میں کہا کہ بھئی کمال ہے! لکھنؤ اور فقیر۔ دونوں میں تو دور دور تک کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ وہاں موجود لوگوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ میاں فقیر صاحب کی دکان پر دیر

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

رات تک عاشقانِ اردو کی محفل جمتی ہے اور آئے دن یہاں فکرِ اردو میں پُرمغز بحثیں بھی ہوتی ہیں۔ چائے نوش فرماتے ہوئے مجھے اس بات کا ڈر ستانے لگا کہ کہیں دوبارہ دہلی اور لکھنؤ کی ادبی فتوحات کا ذکر نہ چھڑ جائے!! مثل ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ سے بھی خوف کھاتا ہے۔ لیکن ایمان کا تقاضہ ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر درخت کا ایک پتّا بھی نہیں ہلتا، ٹہنی تو دور کی بات ہے۔ توجہ درکار ہے کہ ذرا سی دیر میں دکان پر چہل پہل ہو گئی۔ چند حضرات تو جانے پہچانے ہی نکلے۔ سیمینار میں بعض لوگوں سے ملاقات بھی رہی۔ مجھے دیکھتے ہی ایک صاحب نے بغیر کسی تمہید کے سیمینار کا تذکرہ شروع کر دیا۔ یعنی ''موازنۂ دہلی و لکھنؤ'' کی بحث کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ قبلہ فخر یہ فرمانے لگے:

''بات زبان و ادب کی ہو یا کھانے پینے کی، شہر لکھنؤ کا جواب نہیں۔ 'فسانۂ عجائب' سامنے کی مثال ہے۔ سرور نے میر امن کی داستان 'باغ و بہار' کے جواب میں ماشاء اللہ کس قدر فارسی آمیز اور لازوال داستان لکھی!! اس کے مقفیٰ و مسجع جملوں پر امام باڑے کی چھتیں اڑتی تھیں۔ اس کی قرأت میں اچھے اچھے فارسی داں حضرات کی زبان لرزتی ہے۔ 'باغ و بہار' کو جس نے چاہا پڑھ لیا۔ ایسی سادگی بھلا کس کام کی!

ارے ہاں! شہرۂ آفاق مثنوی 'گلزارِ نسیم' پر اہلِ لکھنؤ نازاں ہیں۔ اس کے اختصار پر دنیا جہان کی ضخامت قربان! میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' 'گلزارِ نسیم' سے بھلا آنکھ ملا سکتی ہے! جب زبان و ادب کی دنیا میں لکھنؤ، دہلی سے اس قدر نمایاں و ممتاز ہے تو خورد و نوش اور گفتار و اسلوب کی بات ہی جدا ہے۔ یاد رکھیے کہ دہلی کو اگر اپنی سادگی و پرکاری پر ناز ہے تو لکھنؤ ہمیشہ اپنی رنگینی پر فخر کرے گا۔

جناب! آپ کس دنیا کی مخلوق ہیں؟ لکھنؤ اور دہلی کے جداگانہ دبستانوں کی ایجاد یوں ہی نہیں ہوا ہے۔ خدا نے چاہا تو سادگی اور رنگینی کا یہ فرق رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ آمین!''

قبلہ کی باتیں میں خاموشی سے تادیر سنتا رہا۔ مجھے تو دہلی کی سادگی اور لکھنؤ کی رنگینی دونوں سے محبت رہی ہے۔ خاکسار کو ''باغ و بہار'' اور ''فسانۂ عجائب'' کے درمیان کسی بھی طرح کی دوئی پسند نہیں۔ اس لیے کسی ایک کی جانب داری کا سوال ہی نہ تھا۔ مجھے تو ایسی سوچ سے ہی کوفت ہوتی ہے۔ لیکن صاحبِ عقل و دانش کی عالمانہ تقریر سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسی بہانے میری بہت سی ذہنی گتھیاں سلجھ گئیں۔ میرے اوپر دبستانِ لکھنؤ کا ہر باب روشن ہو چکا تھا۔ افسوس کہ خاکسار میاں فقیر کو چائے کے پیسے دینا ہی بھول گیا۔ غالبؔ تو کوچۂ یار سے صرف بے آبرو ہو کر نکلے تھے لیکن میں لکھنؤ سے مقروض ہو کر نکلا۔ مجھے اب میاں فقیر کی قلندرانہ عظمت کے آگے آصف الدولہ کی شاہانہ فیاضی بے وقعت محسوس ہونے لگی ہے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

ڈھائی گھنٹے کا علی گڑھ

اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ خدا کی مرضی کے بغیر ہوا نہیں چلتی!! علامہ اقبالؔ نے بھی اپنی اشتراکی نظم ''لینن خدا کے حضور میں'' میں تدبیر کو تقدیر کے ہاتھ کا کھلونا بتایا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ نظم پڑھ رکھی تھی ورنہ یاروں کی یاوری سے یقین اٹھ جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں پچھلے پانچ برسوں سے دہلی میں مقیم ہوں۔ اس طویل مدت کے دوران سرزمین علی گڑھ میں حاضری دینے کی جانے کتنی قسمیں ٹوٹیں؟ اور جانے کتنے ارادے بدلے؟ سچ پوچھیے تو مجھے اب اس کی صحیح تعداد بھی معلوم نہیں۔ لیکن کیا کہیے انسان قسمت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ تدبیر اور تقدیر کی اسی کشمکش کو سمجھنے کے لیے نسل آدم ابتدائے آفرینش سے تا قیامت الجھی رہے گی۔

دراصل اس ناکامی قسمت کے اصل ذمہ دار میرے کچھ دوست ہیں۔ یہاں ان کے نام کا ذکر کرنا گویا آفت مول لینا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوتاہیاں اپنی ہیں لیکن دوسروں کو موردِ الزام ٹھہرانا زیادہ سودمند ہے۔ دراصل دوستوں سے جب بھی علی گڑھ یونیورسٹی آنے کی اپنی شدید خواہش کا اظہار کرتا تو کوئی نہ کوئی عذر فطری یا غیر فطری طور پر سامنے آ جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کم از کم تین بار ''یوم سرسید'' تقریب میں شرکت کا خواب چور چور ہوا۔ ہر بار وہی کہانی وہی بہانہ!!! ''یوم سرسید'' کے موقع

پر غضب ناک بھیڑ ہوتی ہے۔ مہمانوں سے پورا کیمپس کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ قدم رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ اکثر و بیشتر شائن ڈائی کا خطرہ بھی سر پر سوار رہتا ہے۔ کبھی کبھی کھانے کے وقت بھگدڑ بھی مچ جاتی ہے۔ بریانی مشکل سے ہاتھ آتی ہے۔ افسوس کہ خوفِ طعام و قیام کے درمیان میری دیرینہ آرزوئیں تادیر سسکتی رہیں۔

بنارس سے دہلی اور دہلی سے بنارس آتے جاتے ٹرین جب بھی علی گڑھ ریلوے اسٹیشن سے گزرتی تو جذبۂ عقیدت اس قدر جوش مارنے لگتا کہ رخت سفر کے ساتھ ٹرین سے کود جاؤں۔ لیکن افسوس کہ حوصلے نے کبھی ساتھ نہ دیا۔ آخر کار گہری عقیدت کے طفیل بارگاہ خدا میں میری رضا پر مہر لگ ہی گئی۔ حال ہی میں اپنے ایک کرم فرما کی وجہ سے مجھے علی گڑھ یونیورسیٹی کے دیدار کا شرف حاصل ہوا۔ مالک کائنات موصوف کو اجرِ عظیم سے نوازے!! دل میں ایسی بے صبری اور ایسی بے کلی کبھی کبھار پیدا ہوتی ہے۔ درحقیقت تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کے اس حسین گہوارے کو جی بھر کر دیکھنے کی ساعت تھی، جسے میں نے اکثر خوابوں میں دیکھا تھا۔ خواب اور حقیقت کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ حائل ہے۔ لیکن ''آج آنکھ نے دیکھا تو یہ عالم ہوا ثابت'' کی مانند اس خواب کی حقیقت مجھ پر عیاں ہوگئی۔ سچ ہے کہ خواب سے حقیقت تک کے اس لمبے سفر کی تکمیل میں خاکسار کی بے شمار تمنائیں شامل حال رہیں۔

دوپہر ڈھائی بجے مہانندہ ایکس پریس سے اترتے ہی دل میں علی گڑھ کی سرزمین کو چوم لینے کی بے اختیار خواہش پیدا ہوئی۔ مجازؔ نے تو آسمان کو یہاں کے ذرات کا بوسہ لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ خیر رکشا پر سوار ہوتے ہی میں وہاں کے ہر ایک منظر کو اپنی آنکھوں میں انتہائی محبت سے قید کرتا رہا۔ لدے پھندے میک ڈونالڈ ہاسٹل پہنچتے ہی سب سے پہلے غسل خانے کا رخ کیا۔ غسل خانے میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں مچھروں کی ایک بڑی جماعت گزشتہ کئی برسوں سے محروم غسل ہے۔ بات کچھ

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

یوں ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار مچھروں کا اتنا بڑا ہجوم دیکھا تھا۔ میں نے زور زور سے تولیے کو ہوا میں لہرانا شروع کیا اور منت سماجت کی تب کہیں مچھر غسل خانے سے باہر نکلے۔ کئی ایک تو جھنجھلاہٹ اور غصے سے پانی بھری بالٹی میں کود پڑے۔

غسل سے فارغ ہوتے ہی پیٹ میں چوہے کودنے لگے۔ لہذا شکم کی آگ بجھانے کے لیے شدید چلچلاتی دھوپ میں ہم یونیورسٹی سے متصل شمشاد مارکیٹ میں تادیر بھٹکتے رہے۔ ہمیں چکن بریانی کی تلاش تھی لیکن محرومی قسمت کہیے کہ آلو کے پراٹھے پر ہی صبر کرنا پڑا۔ شاید پہنچنے میں ذرا تاخیر ہوگئی تھی۔ ہزار بھاگ دوڑ کے بعد ہم ایک دوکان میں جا گھسے۔ بظاہر یہ کوئی معمولی دکان تھی۔ مکھیوں کی یلغار جاری تھی۔ پنکھے اور کرسیوں کی حالت حد درجہ قابل رحم تھی۔ گرمی ایسی کہ سردی کان پکڑے!! بہرحال ہم دکان کے ایک کونے میں کرسی سنبھال کر دراز ہوئے۔ پراٹھے کا پہلا نوالہ حلق میں پھسلتے ہی پرانی دہلی کے پراٹھے والی گلی کی یاد تازہ ہوگئی۔

ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی دکان میں چند حضرات تشریف فرما تھے۔ بود و باش اور وضع قطع سے تہذیبی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ انداز گفتگو بھی اس بات کی شہادت دے رہا تھا۔ پوری کائنات علی گڑھ کی تہذیبی قدروں کی قائل رہی ہے۔ مجھے بھی ذاتی طور پر وہاں کی تہذیبی، ادبی اور علمی روایات سے بے انتہا عقیدت ہے۔ لیکن افسوس کہ راقم الحروف کو اس بے مثل دانش گاہ میں تعلیم حاصل کرنے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ گہری عقیدت کے باعث ہی علی گڑھ کے فرزندوں سے بات کرنے میں مجھے یک گونہ روحانی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ ماشا اللہ دوران گفتگو علی گڑھ کی تہذیب وثقافت کی لاتناہی بحث چھڑ گئی۔ کسی شاعر نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ:

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تیری جوانی تک

یعنی علی گڑھ کے تہذیبی وثقافتی تذکرے کے دوران شیروانی کا ذکر کرنا باعث ثواب ہے۔ وہاں موجود صاحبان شیروانی میں ملبوس تھے۔ سوئے اتفاق خاکسار کے تن پر صدری ٹنگی ہوئی تھی۔ اسے خرابی قسمت کہیے کہ صدری کے سبب میں باعث توجہ بن بیٹھا۔ ایسے میں مجھے میر تقی میرؔ کا سفر لکھنؤ یاد آ گیا۔ لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں میرؔ کی وضع قطع کا مذاق اڑایا گیا۔ ان پر جملے کسے گئے۔ لیکن حضرتِ میر کا نام سنتے ہی اہل لکھنؤ کی گھگھی بندھ گئی۔ مجھے میر تقی میرؔ ہونے کا دعوی تو نہیں البتہ دیوان میرؔ ساتھ ضرور رکھتا ہوں۔ ماحول کے پیش نظر میرؔ کی نقل میں اپنی عقل کچھ اس طرح کارفرما ہوئی۔ چند اشعار برجستہ نکل پڑے:

کیا صدری کبھی دیکھی نہیں علی گڑھ کے ساکنو
مجھ کو عجب جان کے دیکھے نہار کے
آیا ہوں محض آپ کی محبت میں ہار کر
ورنہ کوئی مہذب ہیں ہم اپنے دیار کے

مجھے ذاتی طور پر اس بات کا ذرّہ برابر بھی اندیشہ نہ تھا کہ میری صدری ہی وبال جان بن جائے گی۔ ورنہ چند گھنٹوں کے لیے کسی اور سے شیروانی مستعار لینے میں کیا قباحت تھی؟ ماحول جب گرم ہوا تو معاملہ موازنے تک جا پہنچا یعنی ''موازنۂ صدری وشیروانی''۔ اس بحث وتکرار کے سامنے آفتاب کی حدت اور تیزاب کی شدت ماند پڑ گئی تھی۔ ساتھ ہی دجلہ وفرات کی موجیں بھی خاموش تھیں۔ ماشا اللہ اس تہذیبی ٹکراؤ کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ صدری وشیروانی کے کئی تاریک گوشے منور ہو گئے۔ اپنی معلومات میں اضافہ دیکھ کر میں دل ہی دل میں خوش بھی تھا۔ بغل کی کرسی پر دراز ایک صاحب نے تو صدری اور شیروانی پر کسی سیمینار کی ضرورت محسوس کر لی۔

حسب موقع جناب گویا ہوئے کہ ''صدری وشیروانی کے موضوع پر کسی

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

انٹرنیشنل سیمینار کی ضرورت ہے، تاکہ بین الاقوامی سطح پر لوگ صدری اور شیروانی کے حسن وقبح سے واقف ہوسکیں۔ ''موازنۂ انیس ودبیر'' کے مصنف شبلی نعمانی کا تعلق بھی علی گڑھ سے تھا۔ مرحوم کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ ''موازنۂ انیس ودبیر'' کی چنگاری سے کبھی صدری اور شیروانی کے دامن جھلس جائیں گے۔ مئی کی تپتی ہوئی دوپہر، گرم گرم پراٹھا، لال مرچ کی تیکھی چٹنی اور اوپر سے یہ عالمانہ مباحث!! اس کربلائی کیفیت سے جسم کے ساتھ ساتھ میری روح بھی مضطرب ہو اٹھی۔ جب ماحول میں تمازت بڑھی تو ایک صاحب جھٹ سے اپنی پیشانی پر بل دیتے ہوئے شیروانی کی حمایت میں فرمانے لگے:

''شیروانی علی گڑھ کی تہذیبی معراج ہے۔ اماں! شیروانی کے بغیر تہذیب وثقافت کا تصور محال ہے۔ کوئی اہل شیروانی ہی تہذیب کا سچا وارث ہوسکتا ہے۔ پوری دنیا یہاں کی تہذیب کو سلام کرتی ہے۔ مولانا آزاد اور جواہر لعل نہرو جیسی عظیم تر ہستیاں شیروانی سے ہی پہچانی جاتی تھیں۔ اردو شاعروں اور ادیبوں کا ایک بڑا قبیلہ شیروانی کے سحر میں گرفتار تھا۔''

موصوف کی تقریر ختم ہوتے ہی سامنے بیٹھے حضرت نے میری معلومات میں مزید اضافہ کردیا۔ ہلکے گلابی رنگ کی شیروانی میں ملبوس صاحب عقل ودانش نے اپنے زور خطابت کا سہارا لیتے ہوئے شیروانی کے کئی نئے دریچے وا کردیے۔ ان کی چند باتیں انھیں کی زبانی پیش کیے دیتا ہوں:

''خدا بھلا کرے زمانے کا! آپ حضرات صدری کے حصار سے ذرا باہر تو نکلیے۔ کب تک صدری کا غلامانہ بوجھ ڈھوتے پھریں گے۔ شاید آپ کو اس بات کا علم ہو کہ علی گڑھ میں شیروانی بھی تحقیق

کا موضوع بنتی ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ حال ہی میں میرے ایک یار نے ''شیروانی کی ادبی فتوحات'' کے عنوان سے ایم فل کا مقالہ تحریر کیا ہے۔ تحقیق وتنقید کی مانند علی گڑھ اور شیروانی میں بھی دامن اور چولی کا رشتہ ہے۔ شیروانی میں ملبوس علی گڑھ کے تعلیم یافتہ شرفاء ہجوم میں بھی باآسانی پہچان لیے جاتے ہیں۔ جناب! آپ سے مخلصانہ گزارش ہے کہ اسی موقع پر لگے ہاتھ ایک عدد شیروانی کا آرڈر کرہی دیجیے۔''

فرزندان علی گڑھ کی شعلہ بیانی سے مستفیض ہونے کے بعد میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ بھی مجھے ٹکٹکی لگائے نہار رہے تھے۔ جب محفل سرد ہوئی تو میری خاموش زبان میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی۔ موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے میں نے جھٹ سے بولنا شروع کیا کہ آپ حضرات اپنی تمام تر توجہ ظاہری چیزوں پر ہی صرف کیوں کرتے ہیں؟ گستاخی معاف ہو!! میری ناقص رائے ہے کہ علی گڑھ کی باطنی قدریں سسک رہی ہیں۔ ان قدروں کو سینے سے لگانے اور انھیں دوبارہ زندہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے اسی عمل سے اس ادارے کے روح رواں مرحوم سرسید احمد خاں کی روح کو تسکین اور آنکھ کو ٹھنڈک پہنچ سکتی ہے۔

اس چمنستان کے بلبل اسرار الحق مجاز نے انھیں داخلی قدروں کو ابر بن کے سارے جہاں پر برسنے کا حسین خواب دیکھا تھا۔ لیکن افسوس کہ آپ لوگ ابھی تک شیروانی، ٹوپی اور جوتے میں اٹکے ہوئے ہیں۔ بھلا شیروانی اور ٹوپی کے سہارے کوئی شخص مہذب ہونے کا دعوی کیسے کرسکتا ہے؟ بلاشبہ شیروانی علی گڑھ کی تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہے۔ لیکن صرف اسی پر صبر وقناعت کرکے بیٹھ جانا کوری حماقت ہے۔ آپ صاحبان کی خدمت میں یہ عرض کردوں کہ میں بھی یہاں کی تہذیبی، علمی اور ادبی روایات سے بخوبی

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

واقف ہوں۔ مجھے علی گڑھ کے ذرے ذرے سے محبت ہے۔ میں شیروانی کی شان و عظمت کا قائل ہوں۔ شیروانی سے مجھے کوئی ذاتی بغض نہیں۔ خاکسار صدری ضرور شوق سے پہنتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے دل میں شیروانی کا احترام نہیں۔ میرے ولیمے کے حق میں دعا کیجیے تا کہ آپ صاحبان کی دیرینہ آرزو کی تکمیل ہو سکے۔

چوں کہ معاملہ صدری کے وقار کا تھا اس لیے خاموش رہنا مناسب نہ تھا۔ میں نے اہل محفل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ شیروانی کی عظمت اپنی جگہ مسلم لیکن صدری کسی بھی اعتبار سے شیروانی سے کمتر نہیں۔ جگ ظاہر ہے کہ آج بڑے سے بڑے ادیب، شاعر، سیاست داں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ صدری کی جادونگری میں کھو گئے ہیں۔ میں یہاں صدری کے چہیتوں کا نام لینے سے قاصر ہوں کیوں کہ اگر کسی ایک بھی دیوانے کا نام غلطی سے چھوٹ گیا تو جانب داری کا الزام لگنا یقینی ہے۔

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے راقم الحروف نے لمبی چوڑی تقریر کر دی۔ بلا مبالغہ صدری لفظی اور اصطلاحی معنوں میں صدری تمام تر ملبوسات کا سرتاج ہے۔ ارے ہاں! آپ صدری کی عصری افادیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگا سکتےہیں کہ اب ہندو پاک کے کسی بھی سیمینار یا مشاعرے کے صدر محترم کے لیے صدری زیب تن کرنا لازمی قرار دی جانے لگی ہے۔ بلکہ دعوت نامے کے لفافے پر ہی جلی حروف میں لکھا جانے لگا ہے کہ ’’نوٹ: کرسی صدارت سے چپکنے سے قبل صدری دھارن کرنا لازمی ہے۔‘‘ ابھی گزشتہ مہینے غالباً مارچ کی بات ہے۔ ’’طنز و مزاح کی عصری ضرورت‘‘ کے عنوان سے دہلی میں ایک قومی سیمینار منعقد ہوا۔ گلے میں صدارتی ہار پہننے کی آرزو لیے حیدر آباد سے تشریف فرما مشہور و معروف ادیب و خطیب محترم عظمت حیدر آبادی صاحب کو عین وقت پر اپنے صدارتی وقار سے ہاتھ دھونا پڑا۔ حتیٰ کہ صدری کا تذکرہ تو آسمانی صحیفوں میں بھی آیا ہے۔ اپنے دعوے کو دلیل فراہم کرتے ہوئے میں نے یہ آیت سنائی ’’رب اشرح لی

صدری و یسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی ‘‘۔ آپ حضرات شیروانی کا لفظ قرآن میں نہیں دکھا سکتے۔ میری مدلل گفتگو سن کر محفل پر ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے ہم سب نے اپنی اپنی راہ لی۔

افسوس! صد افسوس! کہ ڈھائی گھنٹے کا نصف حصہ صدری اور شیروانی کی نذر ہو گیا۔ شام ساڑھے پانچ بجے کی ٹرین تھی۔ گھڑی کی سوئیاں تیزی سے اپنی مسافت طے کر رہی تھیں۔ چمن کی رنگا رنگیکو جی بھر کر دیکھنے کی حسرت دل میں دبی دبی سی رہ گئی۔ سینے میں خلش لیے میں کودتے پھاندتے کسی طرح ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں مسافروں کا ایک گھنا جنگل نظر آیا۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت سے آدھے گھنٹے تاخیر سے اسٹیشن پہنچی۔ آنکھوں میں انتظار کی تھکن لیے لوگ ٹرین کو کوستےہوئے نظر آئے۔ لیکن ٹرین خاکسار کے حق میں سولہ آنے وفادار ثابت ہوئی۔ ٹرین میں سوار ہوتے ہی میں نے بارگاہ الٰہی میں گڑگڑا کر دعا کی کہ ’’اے اللہ!! مجھے دوبارہ علی گڑھ ایسے بھیس میں بھیج، جس پر شیروانی اور صدری کا سایہ تک نہ پڑے۔ آمین!!!

☆☆☆

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

مس اردو سے ایک یادگار ملاقات

محبت سود وزیاں کے احساس سے بالاتر ہوتی ہے۔اس میں کسی بھی طرح کی ملاوٹ ممکن نہیں۔لیکن مجھے خالص اور ملاوٹی ہر طرح کی محبت کے تجربات حاصل رہے ہیں۔آج سینے میں دفن یہ راز فاش ہونے جا رہا ہے کہ اردو سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ اردو میری دھڑکنوں میں شامل ہے، میری سانسوں میں تحلیل ہے۔ برسوں کی ریاضت کے بعد عشق میں ایسی گرمی پیدا ہوئی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی کو بے غرض بھی چاہا ہے لیکن مجھے اس بات کا صاف لفظوں میں اعتراف ہے کہ اردو سے اپنی محبت بے غرض نہیں۔اس میں دودھ اور پانی کی طرح ملاوٹ ہے۔اس کے باوجود اردو قدم قدم پر میرا ساتھ نبھا رہی ہے۔خدا کرے کہ آگے بھی یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔

دل میں خلوص و محبت کا جذبہ اور سینے میں عشق و جنون کی آگ ہو تو افسانے حقیقت میں بدلے جا سکتے ہیں اور خواب کی تعبیر بھی ممکن ہے۔ جب میرے خواب کی تعبیر ہوئی تو افسانے حقیقت میں بدل گئے۔اب میری محبت کا عالم یہ ہے کہ اردو میری رگوں میں خون بن کر گردش کر رہی ہے۔کبھی علامہ اقبالؔ کے جبین نیاز میں ہزاروں سجدے تڑپے تھے۔اسی شدید جذبۂ محبت میں جب انھوں نے خدا کو ''لباس مجاز'' میں دیکھنے کی شاعرانہ خواہش ظاہر کی تو ان کے خلاف مولوی حضرات کی پوری جماعت صف

آرا ہو گئی۔اس جرم کی پاداش میں موصوف پر کفر کے فتوے صادر کیے گئے۔لیکن خدا کے فضل و کرم سے میرا معاملہ اقبالؔ مرحوم سے قدرے مختلف ہے۔میں نے اپنی معشوقہ کو جب لباس مجاز میں دیکھا تو فرہاد اور مجنوں جیسے بلند مرتبہ عاشق بھی میرے سامنے بے وقعت نظر آئے۔آپ کو میری بات بھلے ہی احمقانہ لگے لیکن مجھے کہنے دیجیے کہ ''خود غرض محبت کبھی کبھی بے غرض محبت پر سبقت لے جاتی ہے۔''

جمعرات کی اس یادگار اور حسین شام کو تا عمر بھول پانا ممکن نہیں۔اس خوش نما شام کو اپنی محبوبہ اردو سے میری پہلی ملاقات تھی! جس ہستی سے میں نے برسوں خواب اور تصور کی دنیا میں بے پایاں محبت کی تھی، آج وہ لباسِ مجاز میں سراپا میرے سامنے تھی۔ بات راز کی ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے میں واپس ہو رہا تھا مزار غالب کے پاس اچانک کسی نے نہایت شائستگی سے آواز دی کہ ''ذرا سنیے''۔ پیچھے مڑ کر جب میں نے دیکھا تو ایک بے حد حسین و جمیل، ہونٹوں پر تبسم سجائے حسن کی دیوی مجھ سے مخاطب تھی۔اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں عجب سی چمک پیدا ہو گئی اور دل تیزی سے دھک دھک دھڑکنے لگا۔خوبصورتی ایسی کہ چاند شرمائے! گلابی رخسار، نازک ہونٹ، خمار آلود آنکھیں، ریشمی زلفیں، رومانی ادا اور شائستہ چال گویا کائنات کا سارا حسن مجھ سے مخاطب ہو......!

میں نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا ''جی صاحبہ فرمایئے ؟'' مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے جواب دیا کہ ''جی میں اردو ہوں ۔میں ہر جمعرات کو اپنے عاشقوں سے ملنے کے لیے لباس مجاز دھارن کرتی ہوں۔''میں نے جذبۂ رقابت سے پوچھا کہ آج یہاں کس عاشق سے ملنے آئی تھیں؟ میرے استفسار پر مسرت آمیز انداز میں جواب ملا کہ ''میں آج اپنے دیرینہ عاشق مرزا غالبؔ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے آئی تھی۔میں یہاں اکثر آتی ہوں۔'' جب گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھا تو ہم غالب اکیڈمی کے

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

پاس واقع کریم ہوٹل میں چلے گئے۔ہم دونوں نے ساتھ میں ڈینز بھی کیا۔ ہمارے درمیان مختلف موضوعات پر تادیر باتیں ہوتی رہیں۔اپنی دلربا سے ہونے والی گفتگو کا کچھ اہم حصہ آپ صاحبان کی نذر کرتا ہوں۔

محترمہ! برائے مہربانی یہ بتانے کی زحمت گوارہ کریں کہ'' آپ کا سب سے بڑا عاشق کون ہے؟''

بغیر کسی توقف کے جواب ملا''محمد علی جناح''

جواب سنتے ہی میں چونک پڑا۔میں نے حیرت سے پوچھا کہ''ایسا کیوں؟''

''خدا مغفرت کرے مرحوم کی! دراصل وہ اردو کے حروف تہجی سے بھی نابلد تھے۔باوجود اس کے ماشاءاللہ انھوں نے اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنا دیا۔ایثار وقربانی کی ایسی نظیر نایاب ہے۔خدا مرحوم کی بےلوث محبت قبول فرمائے۔آمین!''

''جی بہت بہت شکریہ! محترمہ یہ بتایئے کہ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا غم کیا ہے۔''

''آپ نے تو میرے زخم کو تازہ کر دیا۔عرض ہے کہ میں ہندوستان کی سرزمین میں پیدا ہوئی۔ہر مذہب وملت کے ماننے والوں نے میری پرورش کی۔میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کی پاسدار ہوں۔سب نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی اور مجھ پر اپنی محبت کے بیش بہا موتی لٹائے۔میں نے ہی آزادی کے متوالوں کے سینے میں انقلاب اور احتجاج کے شرارے بھرے۔سب کی آنکھوں میں آزادی کے خواب سجائے۔لیکن ملک کی تقسیم نے مجھے

اپنے چاہنے والوں سے الگ کر دیا۔مصلحت وسازش کے تحت مجھے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر میرے ساتھ زیادتی وناانصافی کی گئی۔اس طرح میں اپنے گھر ہی میں بے گھر ہوگئی۔اسی لیے تقسیم میرا سب سے بڑا صدمہ ہے۔ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد آج بھی میں اس تلخ یاد سے کانپ جاتی ہوں۔''

''مس اردو! دنیا آپ کو سیکولر اور گنگا جمنی تہذیب کی امین کہتی ہے۔اس کے جواز میں آپ کچھ کہنا چاہیں گی! آپ کے دشمن بھی آپ کے حسن وجمال کے اسیر ہیں اور چپکے چپکے آپ سے عشق بھی فرماتے ہیں۔مگر جانے کیوں بعض اوقات ان کا رویہ منافقانہ اور سلوک جارحانہ ہوجاتا ہے؟''

''ارے صاحب! میں ابتداء سے ہی سراپا سیکولر رہی ہوں۔ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے؟ میری پوری تاریخ آپ کے سامنے ہے۔میں کن کن باتوں کا ذکر کروں؟ سب سے خاص بات یہ کہ مجھے سنوارنے اور سجانے میں غیر مسلم عاشقوں نے اپنی نینداور اپنا سکون حرام کیا۔خدارا! میں کس کس کا نام لوں؟ اگر غلطی سے کسی ایک بھی دیوانے کا نام چھوٹ گیا تو مجھ پر بے وفائی کے سارے الزامات کے لگ جانے کا خطرہ لاحق ہے۔ارے صاحب! مجھ میں اگر عید کی سیوئیوں کی مٹھاس ہے تو میرا وجود ہولی کے رنگ میں بھی شرابور ہے۔اگر میں محرم کا سوگ مناتی ہوں تو دیوالی کی روشنی سے بھی منور ہوں۔محمد کی توصیف کرتی ہوں تو کرشن جی کی بانسری کی دھن پر ناچتی بھی ہوں۔اگر

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

کوئی آنکھ والا اندھا میری اس معصوم و نازک ادا کو سمجھنے سے قاصر ہے تو اس کی جہالت اور بدبختی پر افسوس صد افسوس!''

''جی ہاں! آپ نے بجا فرمایا۔ میں آپ کی ان باتوں سے متفق ہوں۔ اچھا یہ بتائیے کہ آج کے کس ہندوستانی نیتا سے آپ زیادہ ناراض ہیں؟''

''اجی صاحب! آپ نے ملائم سنگھ کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ وہ میرے بڑے پرانے عاشق ہیں۔ لیکن میں ان سے بے حد ناراض اور بے حد خوش ہوں۔ وہ صرف نام کے ملائم رہ گئے ہیں۔ ان کے سب کام کٹھور ہوتے جا رہے ہیں۔ یوپی میں ان دنوں سماج وادی پارٹی اقتدار میں ہے۔ حکومت کی تشکیل و تعمیر کی ایک لمبی مدت کے بعد بھی اتر پردیش اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد جیسے فعال ادارے بے یار و مددگار آنسو بہانے پر مجبور ہیں۔ محبت کا ڈھونگ مجھے ہرگز پسند نہیں۔ میں تو خالص محبت کی دیوانی ہوں۔ محبت کی شریعت میں منافقت شرک ہے۔ خاک ڈالیے ایسی محبت پر!''

''بے حد خوش اور بے حد ناراض!! ارے صاحبہ یہ تو بڑی دلچسپ بات کہی آپ نے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟''

''اجی وہ اس لیے کہ انھوں نے دوران حکومت پرائمری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کی۔ لیکن حیرت و افسوس کی بات ہے کہ آج تک بچوں کو اردو کی درسی و نصابی کتابیں میسر نہ ہو سکیں۔ میں گزشتہ مہینے پورے صوبے کے پرائمری اسکولوں کا دورہ کر کے واپس آئی ہوں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میرے نام پر

روٹی توڑنے والے اساتذہ اردو نہیں پڑھاتے۔ بھلا بتائیے! یہ کیسا عشق ہے؟ افسوس کہ یوپی میں میرے چاہنے والوں کی تعداد دن بہ دن گھٹتی جا رہی ہے۔ نئی نسل اردو سے نابلد ہے۔ ایسے میں عاشقوں کی تعداد کم ہونا فطری و یقینی ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے۔''

''میں نے سنا ہے کہ انسانوں کی طرح زبانوں کے بھی خاندان ہوتے ہیں، آپس میں رشتہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ یعنی دادا دادی، ماں باپ، بھائی بہن، بیوی شوہر، ماموممانی، خالہ خالو وغیرہ۔ دوسری بات یہ کہ ہندی کو اکثر و بیشتر آپ کے ساتھ نتھی کیا جاتا ہے۔ آج میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہندی سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

''جی ہاں! آپ نے بالکل صحیح سنا ہے کہ انسانوں کی مانند ہم زبانوں کے بھی خاندان ہوتے ہیں۔ انسانوں کی طرح ہمارا بھی شجرۂ نسب ہوتا ہے اور اس کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ عربی، فارسی، پنجابی، سندھی، گجراتی، بنگالی، ترکی، ہندی، سنسکرت، ہریانوی اور مگدھی جیسی زبانوں سے ہمارا خون کا رشتہ ہے۔ آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ ہندی میری سگی بہن ہے۔ ہم دونوں کی پرداخت ایک ہی چھت کے نیچے ہوئی ہے۔ ہماری پرورش بھی ایک جیسے ماحول اور معاشرے میں ہوئی ہے۔ یکساں تربیت اور خون کے رشتے کے سبب ہمارا قواعدی ڈھانچہ ایک جیسا ہے۔ بہت سے الفاظ، کہاوتیں اور محاورے وغیرہ بھی مشترک ہیں۔ میرے بہت سے دیوانوں نے میری بہن سے بھی کھلم کھلا عشق فرمایا ہے۔ دل

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

پھینک عاشق منشی پریم چند ہم دونوں کے دام محبت میں گرفتار ہوئے۔اس عاشق کے لیے کبھی کبھی ہمارے درمیان رقابتیں بھی چلتی رہی ہیں۔اپنے دیرینہ عاشق انشاءاللہ خاں انشا کی داستان ''رانی کیتکی کی کہانی'' پر تو ہم دونوں کا حق ہے۔امیر خسرو کی مثال جگ ظاہر ہے۔اس دیوانے نے تو اپنی محبت کا جادو ہم دونوں پر چلایا ہے۔ایک مدت سے ہم دونوں بہنیں اس دیوانے کے عشق میں گرفتار ہیں۔جی ہاں! ہمارے درمیان ایک ازلی رشتہ ہے۔ ہمارے نئے پرانے بہت سے عاشق اس بات کی گواہی دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔''

''ارے میڈم! آپ نے تو بات ہی بات میں اچھی خاصی تقریر کر دی۔کیا آپ کو نہیں معلوم کہ بدخواہ لوگوں نے اس خونی رشتے کے متعلق کتنی نفرتیں اور گمراہیاں پھیلائی ہیں! بے چارے دیوانوں کو بدظن کرنے کی کتنی گندی سازشیں کی گئی ہیں! آپ کی یہ باتیں تعلیم یافتہ جاہلوں کو سمجھ میں کیوں نہیں آتیں؟ بے غیرت لوگ جانے کیوں اس رشتے کو زہر آلود کرنا چاہتے ہیں؟ میرے خیال میں دو سگی بہنوں کو آپس میں لڑانا غلطی نہیں بلکہ گناہ ہے۔ایسے لوگوں پر خدا کی لعنت!''

''آپ کی یہ باتیں بخوبی سمجھتی ہوں۔ابھی پچھلے ہفتے ہی ہم دونوں بہنوں نے دبئی کے ایک مشاعرے میں ساتھ ساتھ شرکت کی۔ وہاں ہم دونوں کو ایک ساتھ مدعو کیا گیا تھا۔میں اپنی عزیز بہن کو مشاعرے میں بلاتی ہوں اور وہ مجھے کوی سمیلن میں مدعو کرتی

ہے۔کبھی کبھی ایک مہینے ہی میں ہماری کئی کئی ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔لیکن افسوس کہ ہمیں ایک دوسرے کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔یہ تو سراسر جہالت، تنگ نظری اور تعصب ہے۔ملک کی تقسیم کے بعد مجھ پر ہندوستان کی سرزمین تنگ کر دی گئی۔اس المناک حادثے کے بعد میں ایک طویل عرصے تک سسکتی اور تڑپتی رہی، اپنی وفا شعاری کی دہائی دیتی رہی۔لیکن مجھ جیسے نازک نازنین پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔خدا دشمنوں کو بھی ایسی تکلیف نہ دے! میرے عاشقوں کو بھی اس بات کا درد ہے کہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'' ''انقلاب زندہ باد'' جیسے انقلابی نغمے و نعرے بلند کرنے والی اس حسین ہستی کو کیوں کر ایسی سخت سزائیں دی گئیں؟''

''ہاں! ایک اہم سوال یہ کہ آپ سے محبت کرنے والے آج کے نوجوان طبقے میں عجیب طرح کی مایوسی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ان کے سامنے بے روزگاری سر اٹھائے کھڑی ہے۔اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں ایک زبان ہوں۔میری زندگی کا اہم مقصد عوام میں امن و آشتی اور محبت و رواداری کا پیغام عام کرنا ہے۔مجھے اس بات کا علم ہے کہ میرے بعض نوجوان عاشق اپنی محرومی اور مایوسی کا اصل ذمہ دار مجھے مانتے ہیں۔کیا یہ سچ نہیں کہ بے روزگاری، غربت اور ناانصافی حکومت کی نااہلی کے سبب پھیلتی ہے۔میں سمجھتی ہوں کہ صرف اردو نہیں بلکہ اکثر و بیشتر زبانیں ان

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

مسائل سے دوچار ہیں۔اس بات کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہیں کہ میڈیکل اور انجینئرنگ کے طالب علم بھی بیروزگاری کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔انھیں آس پاس مکھیاں مارتے ہوئے آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔جناب! آپ بھی تو میری محبت کی چادر اوڑھے ہوئے ہیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ بیتی کو جگ بیتی کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔''

اُف!!اجی لاحول پڑھیے۔میں کیوں کر کسی مایوسی میں مبتلا ہونے لگا! آپ کی محبت نے میری زندگی میں امید وخوشی کے ہزاروں چراغ روشن کیے۔مخلص اساتذہ،وفا شعار دوست،نئی حسرتیں، خوشیاں وشہرت اور حسیں خواب!!خاص بات یہ کہ خاکسار کے لیے بی ایچ یو اور جے این یو جیسی عظیم دانش گاہوں کے دروازے کھلے۔رب کا شکر ہے کہ میں آپ کی محبت میں مبتلا ہوں۔مجھے کئی اور جنم ملے تو بھی آپ کے چوکھٹ پر گزار دوں!!''

''ایک خاص سوال یہ کہ آپ کے بہت سے دیوانوں کے ساتھ ناانصافیاں ہوئیں۔انھیں نااہل ثابت کرنے کی کوششیں کی گئیں ۔ان پر طرح طرح کے بے بنیاد الزامات عائد کیے گئے۔ان کے جذبہ عشق پر سوالات اٹھائے گئے۔ان کی محبت کا مذاق اڑایا گیا۔انھیں رسوا کیا گیا۔لیکن ہر ظلم وستم سہتے ہوئے بھی آپ کے دیوانے مسکراتے رہے اور مشکل لمحات میں بھی آپ کا دامن نہیں چھوڑا۔کیا آپ ایسے مظلوم عاشقوں سے واقف ہیں؟''

''اف! پہلی ملاقات میں ہی زندگی بھر کا حساب۔یاد رکھیے کہ

عشق کا پہلا اصول خودسپردگی ہے۔یعنی پوری طرح معشوق کا ہو جانا۔دوسری بات یہ کہ عشق میں ذلت کا میسر ہونا فضول نہیں بلکہ باعث رحمت ہے۔عشق فنا کی تعلیم دیتا ہے۔ایک سچا عاشق کبھی نتیجے کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ تاعمر بھٹکنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔مجھے معلوم ہے کہ میرے بعض عاشق حضرات آداب عشق پر پوری طرح عمل پیرا رہے ہیں۔ان کے ساتھ بے توجہی اور بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیا گیا لیکن آنے والے زمانے نے سچے عاشقوں کو پہچانا اور انھیں اپنے دل میں جگہ دی۔نظیرا کبرآبادی،منٹو،میاں جی اور ابن صفی جیسے عاشقوں سے آپ ضرور واقف ہوں گے۔ان دیوانوں پر الول جلول الزامات عائد کیے گئے۔کسی پر بازار و عشق کا لیبل چسپا کیا گیا تو کسی پر جنسی و مریضانہ عشق میں گرفتار ہونے کا الزام لگایا گیا۔کسی کے عشق کو مبہم اور علامتی قرار دیا گیا تو کسی نے مقبول عام عشق کے فتوے کی سزا بھگتی۔شرم کی اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ غالبؔ جیسے بے لوث عاشق صادق کو بھی بد بختوں نے نہیں بخشا۔ایسے عاشقان کو رسوا اور ذلیل کرنے کے تمام تر حربے استعمال کیے گئے۔ان کی بیش بہا محبت کو بدنام کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں۔لیکن سچ ہے کہ'' الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔'' آج میرے ان عاشقوں کے سر پر محبت کا تاج چمک رہا ہے۔''

''صاحبہ! اردو زبان و ادب کے فروغ میں منعقد ہونے والے سیمیناروں کے تئیں آپ کا کیا خیال ہے؟''

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

''جی شکریہ! آپ نے بے حد اہم سوال پوچھا ہے۔یاد رکھیے کہ سیمینارا ور اردو میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔درحقیقت میرے عاشقوں کی کئی قسمیں ہیں۔یہاں سب پر الگ الگ روشنی ڈالنا ممکن نہیں۔یہ ضرور ہے کہ اپنے کچھ مخصوص طرح کے عاشقوں کا دیدار سیمیناروں میں ہی ممکن ہو پاتا ہے۔ جب سیمیناروں کے اشتہارات اخباروں میں شائع ہوتے ہیں تو میرے بعض چاہنے والوں میں خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔عید کی طرح ایک دوسرے کو سیمینار کی پرخلوص مبارک باد دی جاتی ہے۔سیمینار والے دن تو ویسے جیسی رونق رہتی ہے۔ہرطرف چہل پہل اور اُچھل کود کا خوش گوار ماحول نظر آتا ہے۔میرے چند ایک عاشق تو ایک دن پہلے سے ہی روزے رکھ لیتے ہیں اور مجال ہے کہ سیمینار سے پہلے روزہ توڑ دیں!عقیدت کے اس جذبے کو عشق کی معراج کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ان کی نظر ہمہ وقت سیمینار کے ماحصل پر جمی رہتی ہے۔ایسے دیوانوں کی توجہ سیمینار ہال کے باہر زیادہ مرکوز رہتی ہے۔ وہ اکثر و بیشتر شامیانے کی جانب تانک جھانک میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ایسے دیوانوں کے مزاج میں صبر وقناعت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔انھیں باہر ٹہلتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔اگر بامشقت ہال میں کسی طرح ہانک بھی دیے جائیں تو درمیانی کرسیاں خالی ہونے کے باوجود پچھلی قطار میں ہی بیٹھنا گوارا کرلیتے ہیں۔تاکہ اعلان جنگ ہوتے ہی جام شہادت نوش فرماسکیں!! اسی لیے سیمیناروں سے میری روح کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔دعا ہے کہ خدا سیمینار

کے سلسلے کو کو تا قیامت جاری رکھے۔آمین!!''

''جی ہاں! مرزا غالبؔ اور علامہ اقبالؔ آپ کے دو بلند مرتبہ عاشق ہیں لیکن کس دیوانے کے عشق میں زیادہ گہرائی ہے؟''

''اوہ!! مجھے مشکل میں کیوں ڈالتے ہیں؟ بھلا میں کس کا دل دکھاؤں۔دونوں میرے چاہنے والے ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ ایک کے نزدیک وصال عشق کی موت ہے جبکہ دوسرے کے لیے وصال عشق کی منزل۔یعنی ایک کا عشق روحانی ہے اور دوسرے کا کچھ اور۔ایک نے خستہ حالی میں مجھے چاہا تو دوسرے نے رئیسی میں میرے گیسو سنوارے۔''

''ارے ہاں! میں ایک اہم بات بھول ہی رہا تھا کہ آپ کے چاہنے والے مختلف قبیلوں میں تقسیم ہیں۔کسی کا عشق ترقی پسندانہ ہے تو کسی کا سینہ جدیدیت زدہ عشق سے سلگ رہا ہے۔علاوہ ازیں چند عاشق ایسے بھی ہیں جو عشق کی مابعد جدید تھیوری سے متاثر ہیں۔ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب عاشقوں کی ٹولیوں میں دہلی، لکھنؤ اور عظیم آباد کی دیواریں کھڑی تھیں۔شاید آپ کو معلوم ہو کہ ان میں غضب کی رقابتیں چلتی رہی ہیں۔ عاشقوں کی ہر جماعت عشق کا قطب مینار کھڑا کرنے کی فراق میں رہتی ہے۔کارزارِ عشق میں کبھی کبھی نوک جھونک اور ہاتھا پائی تک کی نوبت آجاتی ہے۔آپ اپنے ان جملہ عاشقوں کو کوئی نصیحت کرنا چاہیں گی۔''

''اجی صاحب! کسی معشوقہ کے لیے دیوانوں کا آپس میں ٹکرانا

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

عین فطری ہے۔دیوانوں کے درمیان ہونے والی باہمی کشمکش وتصادم سے معشوقہ کو بے انتہا روحانی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ یاد رکھیے کہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں مختلف نظریات وعقائد کا ہونا باعث رحمت ہے۔ کیوں کہ ان دریچوں سے نئی روشنی اور تازہ ہوائیں آتی ہیں۔میرے عاشقوں کو آپس میں ٹکرانے کی قطعی ضرورت نہیں۔سب نے مجھے سنوارا اور سجایا ہے۔اس لیے ہر کسی کو مجھ سے عشق لڑانے کا برابر حق حاصل ہے۔میں سب کی دیوانی ہوں اور رہوں گی ۔ مجھے تو صرف عاشقوں کی انتہا پسندی سے کوفت ہے۔اپنے چاہنے والوں کو یہ نصیحت ضرور کرنا چاہوں گی کہ عشق کے بہانے سیاست کا کاروبار بند ہونا چاہیے۔کیوں کہ خلوص وعقیدت کے بغیر عشق کا تصور محال ہے“

”معذرت محترمہ!! آپ کو دیکھنے اور آپ سے بات کرنے میں وقت کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔اب تو کافی رات ہو چکی ہے۔آج کل شہر کا ماحول بھی کچھ ٹھیک نہیں۔آج میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں کیوں کہ شب فراق کی آہنی دیواریں زمیں بوس ہو چکی ہیں۔ انتظار کی تاریکی پرامید روشنی میں تبدیل ہو چکی ہے۔خواب و حقیقت کے فاصلے ختم ہونے تک ہم دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش رہے......!

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

☆☆☆

”کبوتر بڑے کام کا جانور ہے...... پرانے زمانے کے لوگ عاشقانہ خط و کتابت کے لیے کبوتر ہی استعمال کرتے تھے۔اس میں بڑی مصلحتیں تھیں۔ بعد میں آدمیوں کو قاصد بنا کر بھیجنے کا رواج ہوا تو بعض اوقات یہ نتیجہ نکلا کہ مکتوب الیہ یعنی محبوب، قاصد ہی سے شادی کر کے بقیہ عمر ہنسی خوشی بسر کر دیتا تھا۔“

ـــ ابن انشاء

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

ایسی آزادی سے بہتر ہے غلامی یارب

آزادی بیش بہا نعمت ہوتی ہے۔انسان،شیطان اور چرند پرند سب کے سب آزادی کے آرزومند ہیں۔ جانور کھونٹے سے بندھنا نہیں چاہتا۔ پرندے کو پنجرے کی زندگی پسند نہیں۔شیطان اور ابلیس بھی ماہِ رمضان سے پناہ مانگتے ہیں۔حضرتِ انسان نے بھی اپنی آزادی کی خاطر کیسی کیسی بے مثل قربانیاں پیش کیں !!اردو کے بعض شعراء نے بھی غلامی کی زندگی پر لعنت بھیجی ہے۔شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ تا عمر غلامی کے پہاڑ کو اپنے قلم کے تیشے سے کاٹنے میں ہمہ تن مصروف رہے۔مرحوم نے اپنے فلسفۂ خودی کو غلامی سے نجات حاصل کرنے کا نسخۂ کیمیا قرار دیا ہے۔ اقبالؔ نے غلامی کی زندگی کو جوئے کم آب اور آزادی کو بحرِ بے کراں سے تشبیہہ دی ہے۔ بقول اقبالؔ ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

غلامی کی مختلف قسمیں ہوسکتی ہیں۔مثلاً ذہنی غلامی،جسمانی غلامی،اقتصادی غلامی، مذہبی غلامی،سماجی غلامی اور ازدواجی غلامی وغیرہ وغیرہ لیکن سب سے خطرناک غلامی کے تعلق سے مفکروں اور دانشوروں کے درمیان خاصا اختلاف رائے ملتا ہے۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ ازدواجی غلامی سب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔اس کے

www.urduchannel.in

جواز میں چند دلیلیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ان کی رائے ہے کہ ’’ہر طرح کی غلامی سے نجات ممکن ہے لیکن اپنی بیوی کی غلامی میں جکڑے ہوئے لاچار شوہر کا ہزار کوششوں کے باوجود آزاد ہونا ممکن نہیں۔‘‘ یہی وجہ ہے کہ نوکر کو شوہر پر کئی اعتبار سے فضلیت حاصل ہے۔ایک نوکر کی غلامی جزوقتی ہوتی ہے جبکہ شوہر حضرات کی پوری زندگی بے بسی اور لاچاری میں گزرتی ہے۔اس لیے دانشوروں اور مفکروں کی ایک بڑی جماعت نے اس خستہ حال مخلوق کی بے بسی پر اپنے داخلی غم کا اظہار کیا ہے۔

مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں آزادی کی اہمیت کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن ایسے میں اگر کوئی غلامی کو آزادی سے بہتر قرار دے تو دانشور حضرات کی ساری دانشوری ہی خطرے میں پڑ جائے گی۔فکر وفلسفہ کی دنیا میں زلزلہ آ جائے گا۔ترقی کے تمام تر دعوے کھوکھلے ثابت ہوجائیں گے۔ترنگے کی شان وعظمت کو گہن لگ جائے گا۔ لال قلعے کی عمارت پر لہرانے والا پرچم جھک جائے گا۔جی ہاں! آزادیٔ ملک کی ایک لمبی تاریخ کچھ ایسی ہی تعبیر پیش کرتی ہے۔اگر دھوکہ سے بھی عوام میں بیداری پیدا ہوگئی تو یومِ آزادی کا جشن اچانک ہی یومِ غلامی کے ماتم میں تبدیل ہوجائے گا۔خوشی کی بجائے لوگ سوگ منائیں گے۔جگہ جگہ تعزیتی جلسوں کا انعقاد شروع ہوجائے گا۔قصیدے کی جگہ مرثیہ خوانی مقدم قرار پائے گی۔اس طرح ملک کا مکمل جمہوری نظام ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ بلکہ ملک کے لیڈر صاحبان بھی خون کے آنسو روئیں گے۔

خدا بھلا کرے ملک کے نیتاؤں کا! انھیں اس بات کا بخوبی احساس ہو چلا ہے۔اسی لیے تو بے چارے مذہب اور ذات پات کا جال بچھا کر ووٹ کا شکار کرتے ہیں۔لیکن اس سال کے جشن یومِ آزادی نے انھیں کچھ حد تک مایوس ضرور کیا ہے۔کیوں کہ اس بار عوام میں پہلے جیسا جوش خروش نظر نہیں آیا بلکہ مختلف شہروں پر تو لوگوں نے آزادی کا ماتم بھی منایا اور اظہارِ تعزیت بھی کیا۔جشنِ آزادی کے خلاف پرچے پوسٹر بھی

www.urduchannel.in

بانٹے گئے۔ میں ذاتی طور پر حیران و پریشان ہوں کہ ملک کی عوام اب کس کے خلاف لڑے گی؟ کس سے آزادی مانگے گی؟ ملک کو آزاد ہوئے آدھی صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ گورے بندر ملک چھوڑ کر جانے کب کے روانہ ہو چکے ہیں۔ عوام کی نظر کہیں اپنے ہی ملک کے کالے بندروں پر تو نہیں ہے۔ کیوں کہ بندر اور لنگور تو ایک ہی نسل سے ہیں۔ بندر اور لنگور دونوں ہی درختوں پر اچھلتے کودتے ہیں۔ دونوں کی خوراک یکساں ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ لنگور کے پیٹ میں بندر کی بہ نسبت زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ بظاہر دیکھنے میں بھی لنگور بندروں سے کہیں زیادہ ہیبت ناک ہوتے ہیں۔ بندروں کے نگلے ہوئے خوراک کا اندازہ تو کب کا لگ چکا ہے لیکن آج کے ان لنگوروں نے جس مقدار میں مال ڈکارا ہے، اس کی صحیح تحقیق آج تک دریافت نہ ہو سکی۔

آج کل ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہونے والے اخبارات کی سرخیوں سے احتجاج کی چنگاریاں اٹھ رہی ہیں۔ پٹنہ، گیا، کلکتہ، الہ آباد، گجرات جیسے شہروں سے اٹھنے والے طوفانوں کی آہٹیں بھی سنائی پڑنے لگی ہیں۔ ملک کا غریب اور مزدور طبقہ سڑکوں پر اتر کر اپنی غلامی کے خلاف مردہ باد زندہ باد کے نعرے بھی لگانے لگا ہے۔ بے روزگاری و بے بسی کی وبا میں مبتلا ملک کا نوجوان طبقہ بھی غلامی کی آہنی زنجیروں سے آزادی کا متمنی نظر آتا ہے۔ سچ کہیے تو بے چاروں کی زندگی دھوبی کے کتے کی سی ہو گئی ہے۔ یعنی نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ جیسے کوئی گناہ کر بیٹھے ہوں۔

جاہل طبقہ بھی بے چاروں پر ترس نہیں کھاتا۔ نہ جانے کتنے لوگ رسوائی کے سبب خودسوزی کا قدم تک اٹھا لیتے ہیں۔ اخباروں میں آئے دن ایسی منحوس خبریں نظر آتی ہیں۔ اس صورت حال میں کوئی بھی ایسی آزادی پر لعنت بھیجنا چاہے گا۔ سچ کہیے تو شکستہ حال بے روزگاروں کی بد دعائیں سیاسی رہنماؤں کو کھانے لگی ہیں۔ اسی لیے تو ملک کی عوام غلامی کا بوجھ اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتی ہے۔ ایسے حالات کے تصور

محض سے کلیجا منھ کو آتا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب محبان وطن ملک سے کالے بندروں کا صفایا کریں گے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس بات پر یقین کرنا پڑتا ہے کیوں کہ پچھلے چند برسوں سے گرم ہوائیں بہنے لگی ہیں۔ سورج مغرب سے نکلنے لگا ہے۔ مچھلیاں پیڑ پر چڑھنے لگی ہیں۔ گدھے آسمانوں میں اڑنے لگے ہیں۔ کتے مرغن غذائیں کھانے لگے ہیں۔ گائے بھیڑیے کی شکل اختیار رہی ہے۔ خرگوش سانپ بن رہے ہیں۔ خدا خیر کرے! ایسی صورت حال تو صاف طور پر کسی زلزلے کی آمد کا اشارہ کر رہی ہے۔

اب پٹنہ کو ہی لیجیے۔ وہاں عین پندرہ اگست کے دن اس آزاد ملک کی غلام عوام نے آزادی کا جنازہ نکالا۔ حکمرانوں کے پتلے نذر آتش کیے۔ سب کی آنکھوں میں ملک کو دوبارہ آزاد کرانے کے خواب نظر آئے۔ سڑکوں پر امنڈنے والا غلاموں کا یہ ہجوم دیکھتے ہی دیکھتے ہنگامی جلسے میں تبدیل ہو گیا۔ تادیر انقلابی نعرے فضاؤں میں گونجتے رہے۔ صورت حال سے ایسا اندازہ ہوا کہ ملک کا مقدر تڑ سے بدلنے والا ہے۔

اس ہنگامی جلسے میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد موجود تھے۔ سب نے اپنی بے اطمینانی اور بے چینی کا اظہار کیا۔ سب کو ٹھگے جانے کا شدید احساس تھا۔ کسی نے جلسے کی نظامت تو کسی نے صدارت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ مذاق ہی مذاق میں مقررین کی خاصی طویل فہرست تیار ہو گئی۔ جس نے اپنی زندگی میں کبھی دو لفظ بھی اسٹیج سے نہ کہا ہو، وہ بھی آج شعلہ بیان مقرر بن بیٹھا۔ ایک نئے ہندوستان کے خواب اور اس کی تعبیر میں ہونے والی پرمغز تقریروں کی آنچ سے لال قلعے پر لہرانے والے پرچم میں حرکت پیدا ہو گئی۔ جلسے میں پہلے ہم پہلے ہم کی صورت پیدا ہو گئی۔ جلسے کا آغاز ہوتے ہی ایک صاحب نے مورچہ سنبھال لیا۔ ذرا ان کی تقریر ملاحظہ کیجیے:

''عزیز دوستو! سب سے پہلے ہمیں ترنگے جھنڈے کا مطلب سمجھنا ہوگا۔ ہمیں یہ سمجھنے کی اشد ضرورت ہے کہ ملک کا پرچم ہم سے کیا

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

چاہتا ہے؟ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جھنڈے کا مطلب اور مقصد کیا ہے۔ یہ پرچم ہمارے ملک کی آبرو اور شان ہے۔لیکن افسوس کہ بے چارہ جھنڈا فضاؤں میں لہرانے کی بجائے ہر وقت ندامت اور شرم سے جھکا رہتا ہے۔ایک مدت سے جھکے رہنے کی وجہ سے اس کے کمر و گھٹنے میں درد پیدا ہو گیا ہے۔اب وقت آ گیا ہے کہ اس کا بہتر علاج کیا جائے۔دوسرے یہ کہ علاج کے لیے ایکسرے کی چنداں ضرورت نہیں کیوں کہ مرض اب پوشیدہ نہیں رہا۔اگر وقت رہتے اس کا علاج نہ کیا گیا تو جھنڈے کی موت یقینی ہے۔"

موصوف کی تقریر ختم ہوتےہی ایک دوسرے جناب نے جھٹ سے مائک سنبھال لیا۔انھوں نے بھی جھنڈے کے دوسرے امراض پر اندیشہ ظاہر کیا۔حضرت انتہائی درد آمیز انداز میں گویا ہوئے:

"حاضرین جلسہ! جیسا کہ ابھی ہمارے پہلے صاحب نے فرمایا کہ ایکسرے کی کوئی ضرورت نہیں۔دراصل ملک کے بدترین حالات کے پیش نظر ایسا لگتا ہے کہ جھنڈے کو آکسیجن پر رکھا گیا ہے۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ترنگا مختلف امراض کا شکار ہو چکا ہے۔مرض کی تشخیص کے بغیر صحیح علاج ممکن نہیں۔اس لیے اس کا الٹرا ساؤنڈ اور سیٹی اسکین لازمی ہے۔تا کہ پوشیدہ امراض کو بھی جڑ سے ختم کیا جا سکے۔محبان وطن نے ملک کی آزادی کے لیے اپنی زندگی کی تمام خوشیوں اور خواہشات کو ترک کیا۔نیز اپنی جان کی بازی لگا کر اپنے وطن کی حفاظت کی۔گورے بندروں کو بھگانے

میں انھیں نہ جانے کتنی مشقتیں اور دشواریاں برداشت کرنا پڑیں۔ لیکن افسوس کہ ملک کے لنگوروں نے اپنے وطن کو لوٹنے میں گورے بندروں کو بھی پیچھے دھکیل دیا ہے بلکہ چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔جگ ظاہر ہے کہ یہ کالے بندر وطن کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ڈکیتی، لوٹ کھسوٹ، ناانصافی، بے روزگاری، بدعنوانی، رشوت خوری، فرقہ واریت اور اغوا جیسے متعدد امراض نے جھنڈے کو قبل از وقت بوڑھا بنا دیا ہے۔ پیارے ساتھیو! یاد رکھیے کہ بیمار پرچم کا واحد علاج انقلاب اور احتجاج ہے۔"

اس غیر متوقع انقلابی جلسے کی بھنک لگتے ہی میڈیا اور پولیس والوں نے آزادی کے متوالوں کو گھیر لیا۔دوسرے دن خبر شائع ہونے تک ایک ایک محبان وطن کو گرفتار کر لیا گیا۔ان پر ملک سے غداری کا مقدمہ بھی قائم کیا گیا۔اس واقعے کے بعد شہر کے گلی کوچے میں بھی "انقلاب زندہ باد" کے نعرے گونجتے رہے۔جیلوں سے بھی یہ آواز آتی رہی کہ "جگہ ہے کتنی جیل میں تیرے دیکھ لیا ہے دیکھیں گے۔"

☆☆☆

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

رشوت برائے رحمت

دنیا میں ہر چیز کے دو الگ الگ پہلو ہوتے ہیں یعنی مثبت اور منفی۔ پیش نظر دونوں پہلوؤں پر غور وفکر کے بغیر قدروں کا صحیح تعین ممکن نہیں۔ گرچہ بریانی اور قورمے کا شمار لذیذ ترین کھانوں میں ہوتا ہے لیکن زیادہ ڈکار لینے سے معدے کو خطرہ لاحق ہے۔ یعنی قورمہ اور بریانی سے انسانی روح کو تسکین پہنچتی ہے تو جسم کی مرمت کا اندیشہ بھی ہے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے سانپ کے ڈس لینے سے اگر آدمی قید زندگی سے آزاد ہو جاتا ہے تو اس کے زہر سے کئی مہلک بیماریوں کا علاج بھی ممکن ہے۔ انسانی تہذیب وثقافت کی ترقی میں معاون دنیا کی ہر چیز کو اسی ترازو میں تولنے کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ کرنے سے ہم صالح اور بیش بہا قدروں کی تلاش وجستجو سے محروم رہیں گے۔

تمہیدی گفتگو کے بعد اب انسانی زندگی میں رشوت کی اہمیت پر تفصیلی و مدلل روشنی ڈالی جائے گی تا کہ اس کی مختلف کار آمد جہتیں منور ہو سکیں۔ ہندی داں طبقہ رشوت کو گھوس کے نام سے یاد فرماتا ہے جبکہ انگریزی والے اسے Bribe کہتے ہیں۔ دراصل یہ ایک ایسا دوطرفہ عمل ہے، جو ممکن کو ناممکن اور ناممکن کو ممکن بنانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ سنتری سے منتری اور چپراسی سے وزیر اعظم تک سب کے سب رشوت کے عمل سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہر شخص ملک کی بدحالی اور خستہ حالی کی مکمل ذمہ

www.urduchannel.in

داری رشوت ستانی پر ہی تھوپ دینے کو تیار بیٹھا ہے۔ لوگوں کی نظریں جانے کیوں رشوت کے صرف تاریک پہلو پر ہی ٹھہر سی جاتی ہیں۔ جگ ظاہر ہے کہ رشوت دینے اور لینے کی کامل اہلیت سے محروم شخص ہی اس عمل بابرکت سے بدظن پایا گیا ہے۔ بات صاف ہے کہ رشوت کے فیض عام سے محروم حضرات ہی اسے زہر ہلاہل تصور کرتے ہیں۔

جی ہاں! رشوت ستانی کوئی ہنسی کھیل نہیں بلکہ اس کے لیے گہرا تجربہ اور وسیع تر مشاہدہ درکار ہے۔ جو شخص جس قدر تجربہ کار ہوتا ہے، وہ اتنا ہی رشوت کی برکتوں سے مستفیض ہوتا ہے۔ تجربات کی کمی کے سبب رشوت خوری وبال جان بھی بن سکتی ہے۔ چوں کہ یہ دوطرفہ سماجی عمل ہے، اس لیے رشوت دینے اور لینے دونوں میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تیر اگر صحیح نشانے پر ہو تو رشوت باعث رحمت ورنہ باعث زحمت۔ کیوں کہ معاشرے میں رشوت بدقسمتی سے ابھی تک ایک قسم کا جرم ہے۔ چند ماہ قبل ایک سپاہی کو رشوت کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ عدالت میں پیشی کے دوران اس نے بخوشی اپنا جرم قبول کیا۔ جب جج صاحب نے اس سپاہی سے رشوت لینے کی وجہ دریافت کی تو اس نے نہایت جذبات آمیز اور فخریہ لہجے میں کہا:

> ''جج صاحب رشوت لینا قانون کی نظر میں جرم سہی لیکن میری مجبوری بن چکی ہے۔ ملازمت سے قبل میں بھی اسے جرم کیا بلکہ گناہ سمجھتا تھا۔ لیکن جب مہاجن سے آٹھ لاکھ روپے سود لے کر میں نے رشوت دیے تو میرا نظریۂ حیات ہی بدل گیا۔ میں دن رات پیسوں کے جگاڑ میں مصروف رہتا ہوں تا کہ کسی طرح قرض سے نجات مل سکے۔''

اس سپاہی کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر جج صاحب نے اس کی سزا معاف کر دی۔ درحقیقت رشوت ستانی انسانی سماج و معاشرے کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکی ہے۔

www.urduchannel.in

لہٰذا اس کی افادیت سے چشم پوشی معاشرے کے لیے باعث خسارہ ہے۔جن حضرات کو اس کے وجود سے انکار ہے وہ شدید گمراہی کا شکار ہیں۔خدا ایسے لوگوں کو عقل سلیم عطا کرے!رشوت ستانی کے فروغ کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر کوشش کی جانی چاہیے۔اس کی افادیت کے پیش نظر اسے باضابطہ قانونی درجہ دے کر رشوت کے لیے ایک الگ وزارت کی تشکیل دینے کی اشد ضرورت ہے۔ساتھ ہی ہر ضلع میں اس کے دفاتر بھی کھولے جائیں،تاکہ عوام کو رشوت کے متعلق مزید معلومات فراہم ہو سکیں نیز پیسہ براہ راست سرکاری خزانے میں ہی پہنچ سکے۔

غور کیجیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آج انسانی معاشرے کا کوئی بھی شعبہ اس سے اچھوتا نہیں رہا۔یہاں تک کہ عدالتوں میں بھی اس کا چلن عام ہو چلا ہے۔اگر آپ مالدار ہیں تو ہارا ہوا مقدمہ بھی جیت سکتے ہیں۔لیکن ہاں! اگر بدحال ہیں تو جیتا ہوا مقدمہ بھی ہاتھ سے پھسل سکتا ہے۔کیوں کہ عدالت سبزی منڈی بن چکی ہے۔اب انصاف پانا زیادہ آسان ہے۔رشوت کی برکت سے ہی خطرناک سے خطرناک مجرم کی رہائی ممکن ہے۔عمر قید کی سزا تک معاف ہو سکتی ہے۔قید خانہ آپ کے لیے مہمان خانہ بن سکتا ہے۔جی ہاں صاحبان! آپ نے دیکھا کہ رشوت کی کیسی کیسی برکتیں ہیں؟ پیسوں اور رشوت کی مدد سے کمیاب بلکہ نایاب ڈگریاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔پی ایچ ڈی،انجینئرنگ اور میڈیکل کی پروقار و بھاری بھرکم ڈگریاں اور ایوارڈ وانعام کسی باندی کی طرح خریدی جاسکتی ہیں۔میاں آپ رشوت کے سہارے ڈاکٹر،انجینئر،افسر اور لیڈر کیا ہے جو نہیں بن سکتے۔یہاں تک کہ پیسہ خرچ کر کے شہر کا سب سے مہذب اور شریف آدمی بھی باآسانی بنا جاسکتا ہے۔

پیسہ نااہل کو اہل، بے ایمان کو باایمان، جاہل کو عالم، بدنصیب کو خوش نصیب، غلیظ کو شریف بنادیتا ہے۔بھلا بتائیے کہ رشوت کی ان خوبیوں سے کس شخص کو اور کیوں کر

انکار ہوسکتا ہے؟زندگی کے اس راز کو سمجھ لینے والے کی باچھیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ آپ صاحبان شاید مسٹر ہوشیار صاحب کے نام اور کام سے واقف نہ ہوں۔میں انھیں گزشتہ کئی برسوں سے جانتا اور پہچانتا ہوں۔دنیا میں نازل ہوتے ہی انہوں نے اپنے من میں ڈوب کر اس سراغِ زندگی کو پالیا تھا۔اسی لیے ان کا ہر روز،روزِ عید اور ہر شب،شبِ برات ہوتی ہے۔جبکہ ان کے دوستوں کے یہاں مسلسل محرم جیسا ماحول بنا رہتا ہے۔ان کے دوست یار آج تک ڈھول پھانک رہے ہیں۔مسٹر ہوشیار صاحب اگر چچا غالبؔ کے زمانے میں ہوتے تو ان کا ایک شعر کچھ اس انداز میں ٹپکتا:

جس پاس نوکری پانے کی اہلیت اگر نہ ہو
رشوت اگر نہ دے تو ناچار کیا کرے

اگر آپ میں رشوت دینے کی استطاعت ہے تو ریل گاڑی میں آسانی سے برتھ پاسکتے ہیں۔ارے ہاں! مجھے یاد آیا کہ پچھلی بار دوران سفر ٹرین تک پہنچنے میں ذرا سی دیر کیا ہوئی کہ ٹی ٹی صاحب نے راقم الحروف کی برتھ ہی بیچ ڈالی۔خدا کا شکر ہوا کہ ہلکی سی ہاتھا پائی کے بعد مسئلہ حل ہوگیا۔رشوت کی برکت سے ہسپتال میں ریل پیل کے باوجود آپ کو بیڈ نصیب ہوسکتا ہے۔اگر آپ میں رشوت دینے کی خاطر خواہ قوت نہ ہو تو اپنے ساتھ ایک عدد کفن ضرور لے جائیں تاکہ جنازہ وقت سے رخصت ہوسکے۔تھانے میں بھی گھوس کا عام رواج ہے۔رشوت دے دلا کر کسی کو بے وجہ گرفتار کرایا جاسکتا ہے۔لیکن اگر آپ کنگالی کا شکار ہیں تو اپنے اندر ظلم و ستم سہنے کی عادت پیدا کیجیے۔صبر سے کام لیجیے۔کیوں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔میدان حشر کا انتظار آپ پر لازم ہے۔

اگر آپ کے پاس ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کا کاغذ نہ ہو تو گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں۔یہاں تک کہ اگر گاڑی چوری کی ہے تب بھی اطمینان کی سانس لیجیے۔ ارے بھئی! ظاہر ہے کہ رشوت انسان کو ہر طرح کی پریشانیوں اور مشکلات سے نجات

www.urduchannel.in
www.urduchannel.in

دلاتی ہے۔ یہاں تک کہ رشوت انسان کی بدسکونی کو سکون میں جھٹ تبدیل کر دیتی ہے۔ مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسانی ترقی اور خوش حالی کا راز رشوت ستانی کے عمل صالح میں پوشیدہ ہے۔

اگر آپ پر لاکھوں روپئے بجلی کا بل باقی ہو تو رشوت کے ذریعہ ہی اس مصیبت سے نجات ممکن ہے۔ لاکھوں کی جگہ صرف ہزاروں سے کام چل سکتا ہے۔ اس کی مدد سے آپ بڑے بڑے ٹھیکے لے کر سرکاری خزانے بھی لوٹ سکتے ہیں۔ افسروں کو کچھ لے دے کر دوسروں کی زمین جائداد پر قبضہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ جس معاشرے میں ہر چیز بکاؤ ہو جاتی ہے، وہاں کی زندگی آسان تر ہو جاتی ہے۔ ذہن نشیں رہے کہ ہندوستانی عوام نے بھی انتظامیہ اور حکومت کے لیے بہت سی آسانیاں فراہم کی ہیں۔ خاص طور سے رشوت کے راستے سیاسی رہنماؤں کے حق میں مزید سہولتیں پیدا ہوئی ہیں۔ آج کے زمانے میں انھیں جوڑ توڑ کرنے میں زیادہ آسانیاں فراہم ہیں۔ وہ رشوت کی مدد سے ہی الیکشن میں فتح یاب ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کے تمام عیوب اور کوتاہیوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ ارے بھئی! مذہب بھی تو کسی کے عیب پر پردہ ڈالنے کا حکم دیتا ہے۔ خرید و فروخت کی جانب تو غالبؔ نے بہت پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا:

بک جاتے ہم آپ ووٹوں کے ساتھ ساتھ
لیکن عیار طبع لیڈران دیکھ کر

رشوت ستانی سے مستفیض ہونے کے لیے مالدار و باثروت ہونا بنیادی شرط ہے۔ اگر پیسے کی کمی ہو تو زمیندار اپنی زمین و جائداد فروخت کر کے رشوت دے سکتا ہے لیکن اگر کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو ایسے ناداروں کو گھبرانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ یاد رہے کہ خدا اپنے بندوں کا ساتھ کسی بھی حال میں نہیں چھوڑتا۔ ایسی بھیانک مفلسی و غربت میں انسان کو اپنے مالک حقیقی کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ غور و فکر کا مقام ہے کہ ایک

کڈنی اور ایک آنکھ سے بھی ہماری زندگی کا کاروبار چل سکتا ہے۔ آخر قدرت کی جانب سے ہم انسانوں کو ایک جوڑی گردے اور ایک جوڑی آنکھیں اسی لیے تو عطا ہوئے ہیں تا کہ مشکل وقت میں کام آسکیں۔ ایک کڈنی اور ایک آنکھ کے عوض میں زندگی کی دوسری ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔ دراصل قدرت کی یہ نعمتیں ہمیں مایوسی کے اندھیروں سے بچاتی ہیں۔ اپنے پاس خدا وند کریم کا عطا کردہ واحد یہی سہارا ہے۔ اس لیے راقم الحروف رب کی بارگاہ میں ہر وقت شکریہ ادا کرتا ہے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

اگلے جنم مجھے گئو ماتا نہ کیجیے

سراپا خسارے کی بات ہے کہ ہم سیاست کے صرف چند محدود پہلوؤں پر ہی اپنی نظریں گڑائے رہتے ہیں۔ ایسے میں جانے کتنی کارآمد باتیں ہماری نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔ کتنی خوبیاں واچھائیاں عالم وجود میں آنے سے قبل ہی دم توڑ دیتی ہیں۔ ذرا سوچیے! سیاسی کرشمے کو دمادم کوستے رہنے سے ہماری زبانیں گِھس گئی ہیں۔ ہماری عقلیں جانے کہاں چرنے چلی گئی ہے؟ ذرا غور فرمایئے صاحبان کہ جس سیاست نے ذرے کو آفتاب بنایا۔ زمین کو آسمان کی بلندی عطا کی۔ ہم نے اس کے بارے میں ایک لمحہ بھی ٹھنڈے دماغ سے نہیں سوچا۔ غور طلب ہے کہ کیا ایک جانور کو انسانی وقار وعظمت عطا کرنا کوئی ہنسی کھیل ہے! ایشور بھلا کرے ان سیاسی رہنماؤں کا جنھوں نے گائے کو انسانوں پر فوقیت بخشی۔ اسے ''ماتا'' کی عزت واحترام سے نوازا۔ اس کے گوبر اور پیشاب کو دودھ سے مقدّس سمجھا۔ اس کے لیے آدھار کارڈ بنوانے کا راستہ صاف کیا۔ سب سے بڑی اور اہم بات یہ کہ گائے ماتا کو سیاست میں بھرپور جگہ دی۔

شاعر مشرق نے ''تو شب آفریدی من چراغ آفریدم'' کے پس پردہ اپنے وجود کا برملا اظہار کیا ہے۔ ملک کے ایک نام نہاد قوم پرست سیاسی گروہ نے خدا کی بنائی ہوئی گائے کو ''گئو ماتا'' کا درجہ عطا کر رکھا ہے۔ ایسے دیش بھکتوں کے کارناموں پر

www.urduchannel.in

پوری دنیا انگشت بدنداں ہے۔ اہلِ خرد حواس باختہ ہیں۔ انسانی عقل حیرت زدہ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جانوروں کے پاس قوت گویائی نہیں ہے، ورنہ یہ ملک بغاوت واحتجاج کی آماجگاہ بن جاتا۔ کیوں کہ اگر انسانی دل ودماغ بہ حالت مجبوری گائے کی افضلیت کو تسلیم کر بھی لیں تو ان کروڑوں ہندوستانی جانوروں کو بھلا کون سمجھائے گا۔ بات صاف ہے کہ صرف گائے کو عزت واحترام بخشنا، دوسرے جانوروں کی حق تلفی واستحصال کے مترادف ہوگا۔ اس جمہوری ملک میں سب کو برابری کا درجہ حاصل ہے۔ ایسے میں بیل، بکری، ہاتھی، بندر، بھیڑ، اونٹ، گھوڑا، شیر، باگھ، کتا، بھالو اور گیدڑ وغیرہ سب کو یکساں شہری حقوق حاصل ہونا چاہیے۔ یہ کتنی ناانصافی کی بات ہے کہ ملک کی قومی سیاست میں صرف گائے کو جگہ دی گئی۔ دوسرے جانوروں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ جبکہ انسانی تہذیب وثقافت کے فروغ میں ہر جانور نے اپنا مخصوص کردار ادا کیا ہے۔

اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ گائے ایک بے ضرر قسم کا جانور ہے۔ وہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ اس کی سادہ لوحی جگ ظاہر ہے۔ لیکن اسے مذہب کی بنیاد پر دیا گیا ریزرویشن غیر منطقی اور غیر فطری ہے۔ سنگھی دانشوروں کی عقل ماری گئی ہے۔ ایک طرف مذہب کی بنیاد پر دیے جانے والے ریزرویشن کی مخالفت کرتے ہیں تو دوسری جانب مذہب کی آڑ میں کسی جانور کو ''ماتا'' کے لقب سے نوازتے ہیں۔ ذرا بے چارے بیلوں کے بارے میں بھی غور کیجیے۔ ہائے رے زمانہ! واہ رے انسانوں کی دریا دلی! کسی کو بیل کی اہمیت کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں۔ اس کا تو غلطی سے بھی کہیں ذکر نہیں آتا۔ یہ تو رشتے کے تقدس کی پامالی ہے۔ بیل تو جیتے جی زندگی کا زہر پینے پر مجبور ہے۔ اگر وہ جلال میں آجائے تو گائے کا جمال کس کام کا؟ ان مفکرین حضرات کو آخرت کی بھی فکر نہیں۔ انسانوں کے ساتھ جو کیا سو کیا مگر کم از کم بے زبان جانوروں پر تو رحم کرتے!! مجھے حسبِ حال ایک شعر یاد آتا ہے:

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو جا یا سراپا سنگ ہو جا

بات پچھلے ہفتے کی ہے۔راقم الحروف جمعہ کی شام جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے کنوینشن سینٹر سے گزر رہا تھا کہ اچانک کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میرے علاوہ آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔کوئی وہم سمجھ کر میں نے پھر سے قدم بڑھانا شروع کیا۔جب میرے کان میں دوبارہ آواز پڑی تو میں قدرے حیرت سے ٹھٹھکا۔ اب دیکھتا ہوں کہ سڑک کی دائیں جانب جھاڑیوں میں ایک ادھیڑ عمر گائے آنکھوں میں بے بسی اور امید لیے ٹک ٹکی لگائے مجھ سے مخاطب تھی۔اس گائے کی آواز انسانوں جیسی تھی۔میں حالت استعجاب میں چونک پڑا۔میں نے کسی گائے کو گفت وشنید کرتے ہوئے شاید پہلی بار سنا۔جبکہ میرے یہاں بھی گائے وبھینس پالنے کا رواج رہا ہے۔جانے انجانے مجھ سے بھی بہت سی ناانصافیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہوں گی مگر ایسا واقعہ کبھی بھی پیش نہیں آیا۔یہ بے ضرر مخلوق روکھا سوکھا کھا کر بھی جوئے شیر جاری کرتی رہی۔

اس شام میرے دل ودماغ میں استعجاب وحیرت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ عالم خوشی میں میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔شدت جذبات سے میں غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو دیکھا کہ گائے کالو بھنگی کی طرح محبت سے میرا سر چاٹ رہی ہے۔گائے نے مجھ سے کہا کہ آپ تو دبے کچلوں کی آواز ہیں۔سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے ہیں۔ہماری ذات بھی ان دنوں ایک بے نام سی اداسی ومایوسی کا شکار ہے۔ہمارے بعض مسائل عوام کی نظروں سے اوجھل ہیں۔اتنا سننا تھا کہ میں گائے کے دل کی ہر بات سمجھ گیا۔ہم دونوں کے درمیان کافی دیر تک گفتگو ہوئی۔ہماری بات چیت کا کچھ اہم حصہ قارئین کی نذر ہے:

محبوب: سب سے پہلی بات یہ کہ آپ جے این یو جیسی

www.urduchannel.in

یونیورسٹی میں زندگی کے شب وروز گزار رہی ہیں۔اس تعلق سے اپنے تجربات بیان کیجیے:

گائے : دیکھیے جے این یو آنے سے قبل میرے اوپر زعفرانی فکر کا گہرا اثر تھا مگر یہاں لال سلام کے فلک شگاف نعروں نے مجھے بائیں بازو کے رنگ میں شرابور کردیا۔لیکن کبھی کبھی ان کی دورنگی سے بھی گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ مجھے یہاں کوئی پریشانی نہیں۔ یہاں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہے۔پورے کیمپس میں آزادانہ چرتی پھرتی اور مزے کرتی ہوں۔آج کل قومی سطح پر جانوروں میں بیداری پیدا کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔میں اسی مقصد کے تحت یہاں آئی ہوں۔آپ کی دعا رہی تو مجھے کامیابی بھی ملے گی۔

محبوب: دوسری بات یہ کہ آپ کے طبقے کو ''گئو ماتا'' کا درجہ دیا گیا ہے۔آپ کی پرستش کی جاتی ہے۔آپ لوگوں کے لیے ملک میں کئی طرح کی تحریکات چل رہی ہیں۔اس کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیجیے۔

گائے : پہلے یہ کہ میں اپنی ذات برادری کی نمائندگی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔اب میں ملک بھر میں آرایس ایس والوں کے مکروفریب کو بے نقاب کروں گی۔ ان موقع پرست لوگوں نے برسوں سے ہمارے نام پر گندی سیاست کی ہے۔ہماری خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔خود اپنی ماں کی عزت وخدمت نہیں کرتے تو ہماری کیا کریں گے۔یہ سب کچھ ڈرامہ بازی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ برائے مہربانی ہمیں گائے ہی رہنے دیا جائے۔اسی میں

www.urduchannel.in

ہماری بھلائی اور خوشی ہے۔

محبوب: ایک نہایت سنجیدہ سوال کہ آپ کی حفاظت کے بہانے ایک خاص مذہبی طبقے کو نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔آپ کی وجہ سے ملک میں اب تک جانے کتنے فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں۔لاتعداد انسانی جانیں تلف ہو چکی ہیں۔کیا آپ خود کو ذمہ دار مانتی ہیں؟

گائے: دیکھیے ہماری کئی نسلیں ہندوستان کی اسی خاک سے اٹھیں اور اسی میں مل گئیں۔ہم نے اپنے نام پر انسانوں پر ٹوٹنے والے بہت سے مظالم دیکھے ہیں۔لیکن افسوس کہ ہم اب تک قوت گویائی سے محروم تھے لیکن ''درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا''۔ ہمارا جسم سراپا زبان بن گیا ہے۔اب ہر ایک درندگی اور حیوانیت سے پردہ اٹھایا جائے گا۔آر ایس ایس اور سنگھ کے سیاسی رہنماؤں کی رگوں میں ہٹلر کا خون دوڑ رہا ہے۔فاشزم ان کے وجود کا حصہ بن چکا ہے۔جھوٹ، مکاری، دغا بازی، بے حسی، عیاری، درندگی اور بدزبانی ان کی فطرت میں شامل ہے۔گائے کے گوشت (Beef) پر اپنی سیاسی روٹی سینکنے والے بذات خود اس پیشے میں گلے تک ڈوبے ہوئے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ ''برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر'' وزیر اعظم مودی کے اقتدار سنبھالنے کے بعد پوری دنیا میں بیف ایکسپورٹ کرنے میں ہندوستان نے اوّلیت کا شرف حاصل کر لیا ہے۔ یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ بیف ایکسپورٹ کرنے والے سب سے بڑے چار تاجر غیر مسلم

ہیں۔ چند روز قبل سابق جسٹس راجندر سچر نے اس تلخ سچائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بیف کی تجارت کرنے والے ۹۰/فیصد سے زیادہ غیر مسلم ہیں۔ایسی صورت میں اخلاق کا قتل ہندوستانی جمہوریت اور انسانیت کے ماتھے پر کلنک ہے۔ہمارے نام پر اب حیوانیت کا ننگا ناچ بند ہونا چاہیے۔ہاں غائبانہ طور پر ہم خود کو اپنے نام پر ہونے والے فرقہ وارانہ تشدد کا ذمہ دار تصور کرتے ہیں۔

محبوب: جی وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن آپ ان کے خلوص ومحبت کو کس نظر سے دیکھتی ہیں۔

گائے: خاک ڈالیے ایسی محبت پر۔تھو کیے ایسے خلوص پر۔نفرت ودشمنی کی دکان چلانے والے بھلا خلوص ومحبت کے معنی کیا سمجھیں! اندھ بھکت عالم ضعیفی میں چند سکوں کے عوض ہمیں قصائی کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے۔یہ دوغلہ پن اور ڈھونگ نہیں تو کیا ہے؟ ہمیں ان کی تعظیم و احترام کی چنداں ضرورت نہیں۔

محبوب: بہار کے حالیہ صوبائی الیکشن میں بی جے پی نے انسانی مسائل سے قطع نظر آپ کے طبقے کو مرکز میں رکھا۔آر ایس ایس اور بی جے پی کو آپ سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں، لیکن نتیجہ ''بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے'' جیسا رہا۔کیا انھیں آپ لوگوں کی بددعائیں کھا گئیں؟

گائے: اس میں بددعا کی بات نہیں ہے بلکہ بی جے پی نے اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹی ہے۔ہاں البتہ ہمارے نام پر گندی سیاست کر کے ہمیں بدنام ضرور کیا جاتا ہے۔ یہ کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

"اچھے دن" کے خوشگوار نتائج حاصل ہوئے ہیں۔

محبوب: جیسا کے آپ کو معلوم ہوگا کہ الیکشن کے دوران بی جے پی کے لوگوں نے بیف کاروباریوں سے بطور چندہ لاکھوں روپئے وصولے تھے۔آج کل تو آپ لوگوں کا آدھار کارڈ بھی بنوانے کی بات چل رہی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کی برادری کو "قومی جانور" کا درجہ دیے جانے کی لڑائی جاری ہے۔کیا آپ کو نہیں لگتا کہ گائے کی وجہ سے بیل، بھینس، بکری، مرغی اور مچھلی کے ساتھ تعصب کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔آپ تو ان باتوں سے دل ہی دل میں خوش ہوں گی!!

گائے: دیکھیے جناب! کسی کے ساتھ بھی ہونے والی زیادتی سے ہمیں شدید تکلیف پہنچتی ہے۔لیکن ہم مجبور ہیں۔اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم خاموش بیٹھے ہیں۔آپ جانتے ہیں کہ ناسور چند دنوں میں ٹھیک نہیں ہوسکتا۔تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ زمانۂ قدیم سے ہی ہمیں استعمال کیا جارہا ہے۔آج کل آر ایس ایس اور بی جے پی والوں کی وجہ سے میری عزت و تعظیم مٹی میں مل رہی ہے۔افسوس کہ دوسرے جانور میری وفاداری اور دیانت داری پر سوال اٹھا رہے ہیں۔میری برادری کی قومی صدر کے پاس ابھی کل ہی بنگال ٹائیگر کا خط آیا ہے، جس میں انہوں نے ہمارے اوپر سیاسی سازش کے الزامات لگائے ہیں۔مجھے تو ان کم عقل لوگوں پر ہنسی آتی ہے کہ ہمیں آدھار کارڈ کی کیا ضرورت ہے؟؟ ہمیں بے وجہ گھسیٹا جا رہا ہے۔ہماری آہ لگے ایسوں کو!!

ٹنڈے کباب ڈاکٹر محبوب حسن

محبوب: ایک آخری بات یہ کہ راستے سے بھٹکے ہوئے ایسے لوگوں کو کوئی نصیحت یا کوئی پیغام دینا چاہیں گی۔

گائے: آپ تو ہماری برادری کی شرافت اور سادہ لوحی سے بخوبی واقف ہیں۔ناکردہ گناہوں کی سزا کون بھگتنا چاہے گا۔بے وجہ لوگ ہمیں بھی شک کی نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔موت کے ان سوداگروں نے ہماری زندگی میں بھی زہر گھول دیا ہے۔سیاست سے ہمارا دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ہم قدرت کی عطا کردہ ذمہ داریوں میں ہی خوش ہیں۔ماں کا مرتبہ دے کر ہمیں شرمندہ نہ کیا جائے۔اب تو میں رب سے صرف یہی دعا کرتی ہوں کہ "اگلے جنم مجھے گئو ماتا نہ کیجیے!"۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

خدائے سخن میر تقی میرؔ کی شاعری میں دردوغم کے علاوہ غضب کی دوراندیشی جھلکتی ہے۔پیش نظر مصرعہ بظاہر میرؔ کی دردآمیز زندگی کا لیکھا جوکھا معلوم پڑتا ہے۔لیکن راقم الحروف کی زندگی کے نشیب وفراز کچھ اور ہی نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہیں ۔آج کل میرؔ کا یہ مصرعہ میری ذاتی زندگی کے کئی پوشیدہ راز فاش کرنے پرآمادہ ہے۔کیوں کہ اس میں خاکسار کے تلخ آمیز مشاہدات کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔چند برس قبل ''میرے اللہ پی ایچ ڈی سے بچانا مجھ کو'' کے عنوان سے میری ایک تحریراشاعت پذیر ہوئی تھی۔اس تحریر کونصف درجن رسائل واخبارات میں جگہ ملی تھی۔وہ مضمون جگ بیتی سے آپ بیتی تک کا سفر تھا۔اس کی مقبولیت کا خاص سبب یہ تھا کہ اس میں زندگی کی ناہمواریوں اور جمہوری قدروں کی ناکامی کا ماتم کیا گیا تھا۔

سوئے اتفاق اس دوران راقم الحروف بذات خود پی ایچ ڈی کی زلف عنبریں کا اسیر تھا۔اس تحریر کی اشاعت کے بعد میرے دل میں ایک انجانا ساخدشہ اورڈر پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں میری دعا قبول نہ ہو جائے! پھر مجھے اچانک یاد آیا کہ کسی شاعر نے بھی ماضی کی تلخ وشیریں یادوں سے پریشان ہوکر اسے عذاب قرار دیا تھا۔اتنا ہی نہیں بلکہ اپنا حافظہ چھن جانے کی دعا بھی مانگی تھی۔لیکن سب کچھ سلامت ہی رہا۔خدا خدا کر کے پی

ایچ ڈی کے سارے ارکانات رفتہ رفتہ پورے ہوتے گئے اور میرا نامۂ اعمال خیروعافیت سے میرے داہنے ہاتھ میں آ گیا۔پی ایچ ڈی کی ڈگری دراصل تعلیمی دنیا کا حج اکبر ہے۔ اس سے سرخرو ہونے کے بعد الحاج کے طور پر ڈاکٹر کے اعزاز وخطاب کی نوازش ہوتی ہے۔بعض صاحبان اسے ذلت ورسوائی کا سامان سمجھتے ہیں تو بعض عظمت و وقار کا پروانہ۔لیکن میں ان دونوں کی درمیانی کیفیت کا قائل ہوں۔

ذہن نشیں رہے کہ ''میرے اللہ پی ایچ ڈی سے بچانا مجھ کو'' کے پردے میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر حکیم عظمت صاحب کی خستہ حال زندگی کی تصویریں پیش کی گئی تھیں۔ میری اس گستاخی سے وہ مجھ پر بہت دنوں تک نالاں رہے۔حضرت کے متعلق تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ ان کے پیروں میں ریشم کی غلامانہ زنجیر پڑ چکی ہے۔ماشاء اللہ وہ اپنی اہلیہ کی ملازمت میں خوش وخرم ہیں۔دوسری خوش خبری یہ کہ عظمت صاحب کی جہد مسلسل کے باعث ان کی بیگم صاحبہ امید سے ہیں۔

سچ اور جھوٹ میں چولی دامن کا رشتہ ہوتا ہے۔دونوں کا وجود ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہے۔جیسے شوہر کے بغیر بیوی اور بیوی کے بغیر شوہر کا وجود بے معنی ہے۔ انسان سچ اور جھوٹ دونوں کا محتاج ہے۔زندگی کے تسلسل کے لیے سچ اور جھوٹ کا آمیزہ آب حیات کا درجہ رکھتا ہے۔انسان صرف جھوٹ کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔کبھی کبھی اسے سچ کا سامنا بھی کرنا چاہیے۔آج میں سچ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے ہم کلام ہونا چاہتا ہوں۔دراصل میں بذات خود اس مضمون کا کردار بن چکا ہوں۔ دوران تعلیم ہاسٹل کی نرگسی زندگی کسی نعمت سے کم نہ تھی۔وہاں سے اجڑ جانے کا احساس دل کو غم پیہم سے آشنا کر دیتا ہے۔دل کو ہزار سمجھاتا ہوں کہ ایک آشیانہ اجڑ جانے کے بعد ہی پرندہ دوسری شاخ کی تلاش میں نکلتا ہے۔لیکن دل کو ذرہ برابر بھی اطمینان نہیں۔ دلِ نادان کو میرؔ وسوداؔ کی مثالیں بھی دیتا ہوں کہ دہلی فیاضی اور اپنی تمام تر وسعتوں کے

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

باوجود اچھوں اچھوں پر تنگ ہوتی رہی ہے۔جب اس نے میرؔ وسوداؔ جیسے فن کاروں کو نہیں بخشا تو ہم کون سے اپنے منھ میں چاندی کا چمچہ لیے پیدا ہوئے ہیں۔

اچھے دن کی امید بھی دیوانے کا خواب ثابت ہوئی۔سمجھ سے پرے ہے کہ زندگی کو بہلانے اور زمانے کو بہکانے کا اب کون سا معتبر بہانہ ڈھونڈا جائے۔افسوس کہ پڑھنے لکھنے کا کارگر بہانہ بھی ہاتھ سے سرک گیا۔اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو سکتا ہے کہ کوئی انسان اپنے ہی گاؤں میں زبردستی مہمان بنا دیا جائے!! گاؤں کے گلی، محلے اور درودیوار سب کے سب صف میزبان میں کھڑے نظر آتے ہیں۔اگر اس کسک آمیز کرب کا اندازہ قبل از وقت ہو جائے تو انسان اس پرخار وادی کی صحرا نوردی سے توبہ کر لے۔اگر مہینے بھر سے زیادہ رک گئے تو سوالوں کے گھیرے میں آنا جانا یقینی ہے۔گلی کے موڑ پر پیپل کا بوڑھا درخت بھی سوالی بن جاتا ہے۔اس لیے خفیہ بند طریقے سے ہی ٹھہرنے میں عافیت رہتی ہے۔چہرے پر ہر لمحہ ایک مصنوعی قسم کی مسکراہٹ بکھیرنا پڑتی ہے۔لیکن میں اکثر سوچتا ہوں کہ تیل کے بغیر چراغ کب تک جل سکتا ہے!! ایسے میں چچا غالبؔ خوب یاد آتے ہیں:

آگے آتی تھی حال دل پر ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

رشتہ داروں کے ہاں آنا جانا کب کا چھوٹ چکا ہے۔کبھی مصروفیت کا بہانہ تو کبھی ذلت و رسوائی کا ڈر ستاتا ہے۔ابھی جمعرات کی بات ہے۔دیر رات بازار سے واپس ہو رہا تھا کہ راستے میں ایک صاحب ٹکرا گئے۔جب گفتگو شروع ہوئی تو جانے انجانے میں بہت سی باتیں زبان سے نکل پڑیں۔ایک دن بیٹھے بٹھائے یوں ہی ذہن میں خیال آیا کہ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے؟ بھلا اپنے گھر پر رہنا کوئی گناہ تو نہیں! جن کو جو کچھ سوچنا ہے سوچا کریں!! مدتِ دراز سے آنکھوں کا تیل جلایا ہے۔ہنسی آتی ہے

www.urduchannel.in

کہ جس کے اندر عشق کی ابتدائی منزل طے کرنے کا مادہ نہیں، وہ بھی آگ کا دریا پار کرنے والوں سے زبان درازی کرنے کی گستاخی کر بیٹھتا ہے۔صورت حال ایسی کہ اپنا سچ بھی جھوٹ کے سامنے لاجواب نظر آتا ہے۔ہر دل عزیز شاعرہ پروین شاکر نے کاروبارِ جھوٹ سے حد درجہ نالاں ہو کر یہ شعر کہا تھا کہ 'میں سچ کہوں گی لیکن پھر بھی ہار جاوں گی/وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کر دے گا''

بعض لوگ تو لاغر و بے بس سمجھ کر اناپ شناپ مشورے دیتے ہیں۔جبکہ سچائی یہ ہے کہ اپنے پاس کھونے کو کچھ نہیں۔''جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا/ کریدتے ہو اب راکھ جستجو کیا ہے'' کی مانند سب کچھ راہ وفا میں فنا ہو چکا ہے۔لیکن مجھے اپنی معشوقہ اردو سے کوئی گلہ نہیں۔اگر کبھی عالم اضطراب میں کہیں اور رسم و راہ کرنے کا ہلکا سا خیال بھی آیا تو فوراً لاحول پڑھ لیا۔بے وفائی اپنا شیوہ نہیں۔پھر یہ کہ محبت میں سود و زیاں کا احساس فضول ہے۔شاعرِ ہجر علامہ اقبالؔ نے تو زندگی کو سود و زیاں کے اندیشہ سے برتر قرار دیا ہے۔اگر عشق کھرا ہو تو ہجر کے شعلے بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

عشق کی شریعت میں مادیت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔مفاد پرستوں کے لیے عشق کی کھڑکی بھی نہیں کھلتی دروازہ تو دور کی بات ہے۔بھوک و پیاس اور غربت و مفلسی عاشق کے پیر کی زنجیر نہیں بن سکتی۔محبت تو صرف قربانی اور خود سپردگی سکھاتی ہے۔پھر یہ کہ ایسی محبت تو ہر کسی کی جھولی میں آتی بھی نہیں۔راہِ الفت میں اکثر اپنا وجود لہولہان ہو جاتا ہے۔لیکن دل کو بار بار سمجھاتا ہوں۔اپنے دل کو دیوانوں کی مثالوں کے ساتھ سمجھاتا ہوں کہ اردو سے عقیدت مندی اور وفا شعاری تو سراسر نصیب کا کھیل ہے میاں! اردو کو بے غرض چاہنے والوں کی لمبی فہرست موجود ہے، جنھوں نے راہ عشق میں فاقے پر فاقے کھینچے اور پیٹ پر پتھر باندھا۔لیکن اردو کی الفت کو سینے سے لگائے رکھا۔میرؔ، فانیؔ، دردؔ اور نظیرؔ جیسے عاشقوں نے ناداری اور خستہ حالی کی چادر اوڑھے اپنی عمر عزیز صرف کر

www.urduchannel.in

دی۔بس خدا دل میں صبر حضرت ایوبی پیدا کر دے! محبت تو خدا داد جذبہ ہے۔کبھی تو غم کی شام ڈھلے گی۔کبھی تو امید کا سورج چمکے گا۔ایک نہ ایک دن میرے عرقِ انفعال کے قطرے ضرور موتی اور لعل و گہر میں تبدیل ہوں گے۔

میں مذہب عشق کے معاملے میں حضرتِ میرؔ کا پیروکار ہوں۔''اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہی دیکھو''یعنی معشوق کے کوچے کی خاک نشینی کہیں اور کی حکمرانی سے بہتر ہے۔آئینے کی طرح پریشان رہنا اپنی فطرت نہیں۔آخر آدابِ محبت بھی تو کوئی چیز ہے۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے''دیارِ فن میں جہاں منزلیں بھی فرضی ہیں/تمام عمر بھٹکنے کا حوصلہ رکھیو''غمِ دوراں،غمِ جاناں کی پرچھائی ہوتی ہے۔غمِ دوراں کی آڑ میں غمِ جاناں سے چشم پوشی کرنا شریعتِ عشق میں کمزوریٔ ایمان کی علامت ہے۔

اپنی نقلی سند کے عوض جب کوئی منسٹر یا وزیر ذلیل وخوار ہوتا ہے،تو خاکسار کے پاؤں اچانک زمیں چھوڑ دیتے ہیں۔دل میں عجیب سی سرخوشی محسوس ہوتی ہے۔خودی کا تو حال ہی نہ پوچھیے۔اقبالؔ کی شاعری کے بغیر ہی زندگی کی ہر سمت روشن ہو جاتی ہے۔یہ تو خدا کی مصلحت ہے کہ کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ورنہ محمود وایاز کا نازک رشتہ پارہ پارہ ہو جاتا۔اپنی زندگی کا حاصل مطالعہ یہ ضرور ہے:

سند مل گئی مستند ہو گئے
صمدوا سے عبدالصمد ہو گئے

☆☆☆

ہستی اپنی....

نام : محبوب حسن
والد : منظور حسن
والدہ : قمر جہاں
تعلیم : پی ایچ ڈی (اردو) جے این یو،نئی دہلی
ایم فل (اردو) جے این یو،نئی دہلی
ایم اے (اردو،گولڈ میڈل) بی ایچ یو،وارانسی
بی اے (اردو،انگریزی) وی بی ایس پی یو،جونپور
ایڈوانس ڈپلومہ (ماس مڈیا،اردو) جے این یو،نئی دہلی
ڈپلومہ (کمپیوٹر)،این سی پی یو ایل،نئی دہلی
جے آر ایف (اردو) یو جی سی،نئی دہلی

تصنیفات:

عصمت چغتائی اور جین آسٹین (تحقیق وتنقید)
نکاتِ فکشن (تحقیق وتنقید)
تتلی رانی (ادب اطفال)
ٹنڈے کباب (طنز ومزاح)
اردو انگریزی ناول اور تقسیم ہند (تحقیق وتنقید،زیر طبع)
ہم عصر اردو انشائیہ (زیر ترتیب)

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in